جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

علمی دینی اور اصلاحی مجلہ

انوارِ مدینہ لاہور

بیاد

عالمِ ربانی محدثِ کبیر حضرۃ مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ

بانی جامعہ مدنیہ

نگران

مولانا سید رشید میاں مدظلہ

مہتمم جامعہ مدنیہ، لاہور

رمضان المبارک
سنہ ۱۴۱۶ھ

فروری
سنہ ۱۹۹۶ء

مومن کے لیے چھ قسم کے خطرات

حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا ہے کہ مردِ مومن کو چھ قسم کے خطرات ہمیشہ لاحق رہتے ہیں :

(۱) پہلا خطرہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے کہ کہیں وہ اس کی کسی فروگذاشت کی بنا پر اس کے ایمان ہی کو چھین نہ لے[۱]

(۲) دوسرا خطرہ فرشتوں کی طرف سے لگا رہتا ہے کہ وہ کہیں اس کے اعمال نامہ میں کوئی ایسی بات نہ درج کر دیں جو قیامت کے دن اس کی رسوائی کا باعث ہو۔

(۳) تیسرا خطرہ شیطان سے ہے کہ وہ اپنی وسیسہ کاریوں اور رخنہ اندازیوں سے کام لے کر اسے کہیں اپنے دامِ فریب میں نہ پھنسا لے اور اس کے اعمال خیر کو اکارت نہ کر دے۔

(۴) چوتھا خطرہ فرشتۂ مرگ عزرائیل علیہ السلام کی طرف سے ہے کہ وہ کہیں اچانک عالمِ بے خبری میں رشتۂ حیات منقطع نہ کر دیں[۲]

(۵) پانچواں خطرہ دنیائے دوں کی جانب سے ہے کہ کہیں وہ اس کی عارضی چمک دمک پر فریفتہ ہو کر دھوکہ نہ کھا جائے اور قفس رنگ و بُو میں پھنس کر آخرت سے غافل نہ ہو جائے۔

(۶) چھٹا خطرہ بال بچوں کی طرف سے لگا رہتا ہے کہ وہ کہیں ہمیشہ اس کی دیکھ بھال ہی میں مشغول نہ ہو جائے اور وہ لوگ اسے یادِ الٰہی سے غافل نہ بنا دیں اور اس کی وجہ سے وہ غضبِ خداوندی کا مستحق نہ ہو جائے۔

---

[۱] جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس پر مصر رہتا ہے تو اس سے ایمان چھین لیا جاتا ہے۔

[۲] اچانک موت آجائے اس وقت نہ تو یہ نصیب ہو نہ لوگوں کے حقوق ادا کر سکے اور نہ کچھ وصیت کا موقع ملے۔

(المنبہات علی الاستعداد لیوم المیعاد ص : ۱۵۱ - ۱۵۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

سیّد محمود میاں

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم امّا بعد!

گزشتہ ماہ ۷؍فروری کے روزنامہ جنگ میں مسلم لیگ (ن) کے صدر جناب نواز شریف نے کہا ہے کہ "عدالتی نظام بدلیں گے۔ بڑے مجرموں کو سرِعام پھانسیاں دیں گے۔ سعودی عرب میں موجودہ نظام کی وجہ سے جرائم نہیں ہوتے۔ نظام بدلنے کے بعد پاکستان میں بھی جُرم کا دروازہ بند ہو جائے گا۔" نواز شریف صاحب کے مذکورہ بیان سے بظاہر موجودہ عدالتی نظام سے بیزاری اور اسلام سے محبت کا تاثر ملتا ہے۔ مسلم لیگ کے صدر کے جذبات حقیقی ہیں یا نہیں اس کا صحیح علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، لیکن ظاہری حالات کی روشنی میں ان کے جذبات کی صداقت مشکوک ہے، کیونکہ جس پارٹی کے وہ خود صدر ہیں اس کے دستور میں یہ بات شامل نہیں ہے اور سابقہ دَور میں ان کا طرزِ حکومت بھی ان کے اسلامی نظامِ عدل سے لگاؤ کے منافی ہے۔ ممکن ہے کہ ان کو اپنے سابقہ رویّہ پر ندامت ہوئی ہو اور دل میں خوفِ خدا پیدا ہوا ہو اور گذشتہ کی تلافی کی فکر ہوئی ہو، مگر باطن کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ انسان کی رسائی ظاہر تک ہے اس لیے اپنے جذبات کی صداقت پر بطور دلیل پہلا قدم یہ اٹھائیں کہ مسلم لیگ کے دستور میں یہ بات شامل کریں۔ علماءِ حق کو اپنے قریب لائیں۔ دستور کی تشہیر کریں اور اسی بنیاد پر الیکشن میں عوام سے ووٹ طلب کریں۔ ان کی سہولت کے لیے اسلامی نظام (فقہ حنفی) کے نفاذ سے متعلق حضرتِ اقدس والدِ گرامی مولانا سیّد حامد میاں صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کا ایک مضمون بعنوان "نفاذِ شریعت کا سیدھا راستہ شریعت بل یا فقہ حنفی" جو ۱۹۸۶ء میں

حضرتؒ نے تحریر فرمایا تھا اپنے اداریہ میں شامل کر رہے ہیں :

نفاذِ شریعت کا سیدھا راستہ

آج کل نظامِ شریعت کے نفاذ کا مطالبہ مختلف عنوانات سے ہو رہا ہے اور اس کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی، کیونکہ آسان اور واضح طریقہ چھوڑ کر ایسا مطالبہ کرنے والوں کو لمبے راستہ پر ڈالا گیا ہے۔ سیدھا سادہ راستہ تو یہ تھا کہ جس نے اسلامی نظام کے نام پر حکومت سنبھالی پھر ایک عرصہ کے بعد ریفرنڈم اسلام ہی کے نام پر کرایا جسے سلطانِ وقت کے اختیارات حاصل رہے اور آج بھی ہیں وہی بیک جنبش قلم آرڈر نافذ کر سکتا تھا کہ عدلیہ شریعت کے مطابق فیصلے دیا کرے، لیکن اس شخصیت نے پینترا بدل کر یہ ذمہ داری قومی اسمبلی پر ڈال دی اور اب لوگوں کا رُخ اپنی طرف سے ہٹا کر اسمبلی کی طرف کر دیا۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ۔

اسی دَور میں دینی مسائل پر بے معنی بحثیں چھیڑی گئیں۔ ایسے مسائل جن پر ہمیشہ سے اتفاقِ امت چلا آ رہا تھا موضوعِ سخن آرائی بنے۔ حتیٰ کہ اسی دَور میں یہ بحث بھی چلی کہ "پاکستان" کس لیے معرضِ وجود میں آیا۔ کیا اقتصادی عوامل اس کا سبب تھے یا مذہبی جذبات۔ غرض طرح طرح کی بولیاں بولی گئیں اور غلط و صحیح اور حق و باطل کی تمیز ہی ختم کر دی گئی۔

اصل وجہ اس کی اصل وجہ ایک تو انگریز کی ذہنی غلامی ہے کہ اپنی عقل اُن پر تنقید کے حق میں استعمال کرنے سے قاصر ہیں اور ایک وجہ یہ ہے کہ اسلامی قوانین و نظام کے نفاذ کے بعد حکمرانوں کی مطلق العنانی متاثر ہو گی، لہٰذا اسلام کا صرف نام ہی لیا جائے اور اس کی عطا کردہ راحت و رحمت کو پس پردہ چھپائے رکھا جائے، ورنہ اسلامی قوانین خود حکمرانوں پر حاوی ہوں گے۔ جبکہ حکمران یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان پر بھی کوئی اور حاوی ہو۔

اسمبلی یہی حال ہماری مقننہ اسمبلی کا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم ہی قانون ساز ادارہ رہیں۔ ہم جو مناسب سمجھیں قانون بنا دیں۔ اسلامی قانون کا وجود ہمیں حسبِ دلخواہ قانون بنانے سے روکے گا لہٰذا اسے نہ آنے دو۔

یہ ہمارے ملک کے ان حالات کا خلاصہ ہے جو مانع نظامِ اسلام ہیں۔ حکمرانِ اعلیٰ اور ان کی ترتیب دادہ بے اختیار شوریٰ اور پھر بے طاقت اسمبلیاں کچھ اپنی خواہش اور کچھ بنیع قوت جو فوج کے انقلابی افراد پر مشتمل ہے کا آج تک چلا آرہا ہے۔

سیدھا راستہ

آپ کہیں گے کہ اچھا! پھر سیدھا راستہ جس کے ذریعہ اسلام کا نظام عدل نفاذ پذیر ہو سکے کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اپنے یہاں حکومت کے مسلک کا اعلان کرنا ہوگا کہ مملکت کا قانون فقہ حنفی پر مبنی ہوگا۔ جیسے کہ سعودی عرب میں حکومت کا اعلان یہ ہے کہ وہ فقہ حنبلی پر چلتی ہے اور حکومتِ ایران کا اعلان یہ ہے کہ اس کا مسلک فقہ جعفری ہے۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ شیعہ حضرات کا مسلک کیا ہوگا، کیونکہ وہ اپنے لیے فقہ جعفریہ کا مطالبہ کر رہے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کہیں شیعہ بستی ہے تو وہاں ان کے لیے ان کے شیعہ مجتہد کو ان کے مسلک کے مطابق فیصلہ دینے کا مجاز حکومت قرار دے دے گی۔

پھر سوال ہوگا کہ اہلِ حدیث کا کیا ہوگا، کیونکہ وہ کسی امام کے پیروکار نہیں ہیں وہ غیر مقلد ہیں تو اس کا بھی وہی جواب ہے کہ جہاں ان کی آبادی ہوگی وہاں ان کے کسی پسند کردہ عالم کو ان کے فیصلوں کا حکومت اختیار دیدے گی۔ یہ ایسے اشکالات نہیں ہیں جو حل نہ ہو سکتے ہوں۔

مجھے ایک عزیز دوست نے بتلایا کہ جنرل نمیری نے اپنے یہاں جب شرعی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا تو انہوں نے فقہ حنفی پر مبنی قوانین نافذ کیے۔ وہاں کے حکام سے انہوں نے دریافت کیا کہ یہاں کی اکثریت مالکی حضرات پر مشتمل ہے، مالکی علماء حنفی مسلک پر کیسے فیصلے دیتے ہیں اور اسے کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہاں کے علماء مسلک حنفی پر فیصلوں کے عادی ہیں اور اسے اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ اس میں موجودہ (عیسوی) صدی کے اوائل تک تمام نئے پیش آنے والے مسائل کا حل موجود ہے، کیونکہ یہ قوانین ۱۳۳۰ھ تک جب تک خلافتِ عثمانیہ ترکیہ رہی ہے جاری رہے ہیں۔

یہ ان کی گفتگو کا خلاصہ ہے۔ پھر یہ ہوا ہے کہ اس کے بعد سے اب تک تمام نئے پیش آنے والے مسائل پر ہمیشہ ہند و پاک کے علماء فتوے مرتب کرتے رہے ہیں۔ مشینی ذبیحہ درست ہے یا نہیں؟ اس پر گفتگو ہوئی۔ مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے بیان دیا کہ درست۔ مفتی محمود صاحب مرحوم نے بیان دیا کہ درست نہیں اور دلیل واضح کی۔ اس پر مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنے فتوے سے رجوع کا اعلان فرما دیا۔

حتیٰ کہ غیر سیاسی علماء نے بھی بعض سیاسی اُمور پر بحث کی اور فتوے دیئے۔ پارلیمانی نظام جائز ہے یا ناجائز ؟ پارلیمانی نظام میں عورت وزیرِ اعظم ہو سکتی ہے یا نہیں ؟ اس پر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحث فرمائی جو ان کے فتاوی کی جلد پنجم میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگرچہ عوام واقف نہ ہوں اور قانون داں حضرات نے توجہ نہ دی ہو، لیکن علماءِ کرام جدید دَور کے حالات و مسائل پر برابر نظر رکھے ہوئے ہیں اور ان مسائل کو حل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر آج یہ قانون جاری کیا جائے تو ہمارے پاس آج تک کے مسائل کا حل موجود ہے۔ برّصغیر کے علماء کا طریقہ یہ رہا ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر ایک مجتہد ہونے کا دعویٰ کرتا اور اختلاف پیدا ہوتا ان حنفی علماءِ نے یہ طریقہ اپنا لیا کہ پیش آمدہ مسئلہ پر گفتگو کر کے ایک رائے قائم کر لی جائے۔

میرے اسی قابلِ قدر دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا ایک ریاست میں دو مسلک چل سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی جج یا قاضی شافعی مسلک کا پیروکار ہے تو وہ ہٹا دیا جائے گا یا قاضی رہے گا اور اگر قاضی رہے گا تو اپنے مسلک کے مطابق فیصلہ دے گا یا مدعی کے مسلک کے مطابق ؟ مَیں نے کہا کہ قدیم دَور سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ ایک حکومت میں کہ قاضی شافعی بھی رہے ہیں، مالکی بھی رہے ہیں اور یہ طے ہے کہ وہ مدعی یا مدعا علیہ کے مسلک کے پابند نہ ہوں گے، بلکہ اپنے مسلک کی رُو سے فیصلہ دیں گے۔ انہیں مثال کے طور پر مَیں نے یہ مسئلہ بتلایا کہ اگر کسی حنفی مرد نے عورت کو کنایۃً ایک طلاق دے دی یعنی بجائے لفظ طلاق کے اس نے کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جس کے دونوں معنی ہو سکتے ہوں، لیکن اس کی مراد طلاق ہی تھی تو ایسی صورت میں ایک طلاق ہو جائے گی وہ آپس میں اگر راضی ہوں تو نکاح دوبارہ کر لیں، لیکن اگر کسی طرح یہ قضیّہ ایسے قاضی (جج) کے سامنے پیش کر دیا گیا جو شافعی مسلک کا تھا اور اس نے اپنے مسلک کے مطابق یہ فیصلہ دے دیا کہ دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں اور شوہر سے کہا کہ تم رجوع کر لو۔ شوہر نے رجوع کر لیا تو حنفی مسلک میں یہ فیصلہ واجب التسلیم ہو گا۔ جدید نکاح کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس اگر مدعی، مدعا علیہ دونوں شافعی ہوں تو قاضی حنفی ان کے مسلک کے مطابق فیصلہ نہیں دے گا۔ وہ حنفی قانون سے فیصلہ دے گا اور قاضی اور (جج) کے مسلک کو بالاتفاق مدعی و مدعا علیہ کے مسلک پر فوقیت حاصل رہے گی۔ اس اصول کے تحت ہر دَور میں ہر مسلک کے جج بلا اختلاف و نزاع کام کرتے آئے ہیں۔ گویا اصل مدار فقہ پر رہا ہے۔ وہ حنفی ہو یا مالکی، شافعی ہو یا حنبلی۔ پاکستان میں ضرورۃً ان چاروں ائمہ کرام کے ماننے والوں کے علاوہ بھی فقہ جعفریہ ماننے والوں کو اور کسی بھی

فقہ کے نہ ماننے والے طبقہ کو اُن کے آپس کے پیش آمدہ مسائل حل کرنے کے لیے ان کا قاضی دیا جاسکتا ہے۔ یہ معروف پرسنل لا رتو نہ ہوگا۔ یہ پرائیویٹ لا، ایک طبقہ یا گروہ کا قانون ہوگا۔

بعض حضرات جن میں سادہ لوح علماء بھی شامل ہیں یہ کہتے ہیں کہ نظامِ شریعت تدریجاً تھوڑا تھوڑا کرکے لایا جائے، حالانکہ یہ بات بالکل ہی غلط ہے۔ اسلامی نظام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جب وہ آئے گا تو ہر شعبۂ زندگی پر اثر انداز ہوگا۔ اگر آدھا تہائی لایا گیا تو وہ ان قوانین کی موجودگی میں نہیں چلے گا۔ آدھی مشین کسی سائز کی ہو اور آدھی کسی اور سائز کی تو کیا انہیں جوڑ کر چلایا جاسکتا ہے؟ جس طرح یہ ممکن نہیں اسی طرح قانون شرع قانون انگریز، بلکہ تعزیرات ہند کا جمع ہونا ممکن نہیں۔ یہ وہ قوانین ہیں جو انگریزوں نے اپنی غلام قوم کے لیے اس غرض سے بنائے تھے کہ ان میں جھگڑے چلتے ہی رہیں۔ بیس بیس سال مقدمہ بازی میں صرف کریں۔ نسلاً بعد نسلٍ عداوتیں چلتی رہیں۔ انصاف اور دادرسی میں عدل و انصاف ہی کے نام پر زیادہ سے زیادہ تاخیر ہو۔ ہر ممکن کوشش ہو کہ قانون ہی کے نام پہ شکوک پیدا کیے جاسکیں۔ فوراً ہی فیصلہ ہرگز نہ ہونے پائے جبکہ اسلام کے قوانین میں فوری دادرسی اور انصاف دلانا عدلیہ کی ذمہ داری ہے۔ اسی سے امن ہوتا ہے۔ جرائم ختم ہو جاتے ہیں۔

اسی ماہ (مارچ) جناب حکیم امیر علی قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سعودی حکومت میں اسلامی قوانین کی رُو سے فوری دادرسی کی ایک تازہ مثال دی کہ رات چار بجے ایک قتل ہوا اور صبح دس بجے قاتل کو قصاص میں حکومت نے قتل کر دیا۔ گویا اس مجرم کو جرم کے بعد صرف چھ گھنٹے زندہ رہنا تھا۔

انگریزی دَور کی یادگار تعزیرات پر ہمارے قانون دانوں نے تنقیدی نظر نہیں ڈالی، ورنہ اس میں انہیں خامیاں ہی خامیاں نظر آتیں۔ ہمارے یہاں یہ روایت چل پڑی ہے کہ ہر انگریزی چیز کو تنقید سے بالا سمجھا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل تک تھانوں میں اسٹیشنری کے لیے ماہوار الاؤنس اور جیلوں میں قیدیوں کے لیے یومیہ الاؤنس کے طور پر اتنی ہی رقم مخصوص تھی جتنی انگریز نے اپنے دَور میں مختص کی تھی۔

کوئی ملزم تھانہ میں چلا جائے تو اسے مارنا پیٹنا، گالیاں دینا بُرا نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ انگریز کے قانون کی رو سے اس کی رعایا کا ہر فرد غلام تھا اور بے عزّت۔ وہی روش آج تک جاری ہے، لیکن اسلام میں وہ اصولاً اس کے برعکس اس وقت تک باعزّت ہے جب تک اس پر جُرم ثابت نہ ہو جائے اور جرم ثابت ہو جانے کے بعد وہ فقط اس جرم کی سزا کا مستحق ہے نہ کہ گالی گلوچ یا کسی بھی بے حرمتی کا، تو جب

اصولاً اسلام کے قوانین اور موجودہ قوانین میں بعد المشرقین ہو گیا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ موجودہ انگریزی قوانین کو اسلامی قوانین کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

اسلامی نظام میں بہت سے مصارف بیت المال کے ذمے ہوتے ہیں۔ معذور افراد کے وظائف حتیٰ کہ بے روزگار بھوکے افراد کا انتظام بھی اس کے ذمے ہوتا ہے۔ اسلامی نظام میں غریب رشتہ دار کے مصارف امیر رشتہ دار پر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ نیز مسلمانوں میں ہمیشہ انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ رہا ہے اور ان میں ہندوؤں کی بہ نسبت خرچ کرنے کی بہت عادت ہے۔ یہ عادت لاشعوری طور پر موروثی ہے عرصہ سے اس کا صحیح استعمال متروک ہے۔ اس لیے لوگ اپنے ہی اُوپر عیش و عشرت میں اضافہ پر خرچ کرنے لگے پھر بھی ملک بھر میں دینی ادارے، بے شمار مساجد اسی انفاق پر گئی گزری حالت میں بھی چل رہی ہیں۔ دورِ اسلام میں ہر آدمی جو متمول ہوتا تھا۔ ہر وقت دوسروں پر خرچ کرتا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ خود اس کے پاس اپنے لیے کچھ نہ بچتا تھا۔ یہ حال مسلمان نوابوں کا انیسوی صدی تک رہا ہے۔ اسی طرح نوابوں سے نیچے درجہ بدرجہ اپنے سے نیچے والوں پر خرچ کرتے تھے۔ اسی لیے کمیونزم ان علاقوں میں پھیلا ہے جہاں عیسائی، یہودی یا بت پرست آباد تھے۔ اس کی زد میں مسلمانوں کے وہ علاقے بھی آ گئے جو جغرافیائی محلِ وقوع کے ذیل میں اس کی زد میں آتے تھے جیسے بخارا وغیرہ، لیکن وہ اپنے پڑوس کے غریب ترین مسلمان ملک افغانستان کو متاثر نہیں کر سکا جس کی وجہ اسلام کی عطا کردہ سخاوت، فیاضی، مہمان نوازی اور اوپر سے نیچے تک سب میں کسی نہ کسی درجہ میں جذبۂ ایثار کا پایا جانا تھا۔ مزید یہ کہ اقتصادی اور معاشرتی قانون جو اسلام میں موجود ہیں ان پر بھی عمل ہوتا رہا ہے۔ اسلیئے اسلامی ممالک میں کمیونزم کا فلسفہ ہی پہنچا ہے کمیونزم نہیں۔ اقتصادی اور معاشرتی قوانین اور کسی مذہب میں ہیں ہی نہیں۔؟

افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس فطری موروثی صلاحیت سے اگرچہ پاکستان میں بالکل کام نہیں لیا گیا۔ حتیٰ کہ اب معاشرہ کی حالت اور اندازِ فکر ہی بدل گیا ہے۔ اکثریت صرف اپنی ذات کی پجاری بن کر رہ گئی ہے۔ انگریز کے بنا کردہ انکم ٹیکس وغیرہ سے جو فائدہ حکومت کو پہنچتا ہے اور پھر حکومت سے عوام تک آتا ہے اس سے کہیں زیادہ فائدہ اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کی فطری صلاحیت کو اجاگر کر لیا جاتا۔ اسلام میں انکم ٹیکس نہیں ہے، لیکن دفاع کے لیے ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔ بیت المال کے ذرائع آمدنی اور بہت ہیں جن پر اسلامی حکومتیں چلتی رہی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اگر آج بھی اسلام کا مکمّل نظام نافذ العمل ہو جائے تو ہمارا ملک مثالی ترقی کرے گا۔ مکمّل نظام سے میری مراد یہ ہے کہ انگریزی قانون کے بجائے اسلامی قانون کی کتابوں کے تراجم ان ہی مجسٹریٹوں اور ججوں کو مہیّا کر دیئے جائیں کہ فیصلے اس کے مطابق ہوں۔ اسی طرح فوج کے متعلق جو فوج میں رائج قانون ہے اسے بھی اسلامی دَور کے قوانین کے مطابق بنا دیا جائے۔ انگریز کے ترتیب دادہ قوانین کے بجائے اسلامی قوانین کے مطابق جو تراجم کے ذریعہ فوج کو مہیّا کیے جائیں کورٹ مارشل کیا جایا کرے اور اقتصادیات بھی ان ہی قوانین کے تابع ہوں۔

ہمارے ملک میں جو صوبائی عصبیت کی ہواؤں کی لپیٹ میں ہے محض اسلام کا نام لینا اور عمل نہ کرنا، قوانین جاری نہ کرنا اب ایک بے کشش فریب ہوگا جس سے یہ بادِ سموم نہ تھم سکے گی۔ البتّہ اسلامی اصول اقتصادیات اور قوانین پر عمل اسے روک سکتا ہے۔ اس کی رو سے کوئی صوبہ احساس محرومی میں مبتلا نہ رہے گا۔ ملاحظہ ہو "اسلامی منشور"۔ بات اب بھی لمبی ہوگئی ہے۔ اور آپ پوچھیں گے کہ کیوں اور کیونکر، تو مختصر جواب یہ ہے کہ آپ کے سامنے اسلام کا تیرہ سو سالہ دَور ہے۔ اس طویل ترین عرصہ میں مختلف آب و ہوا مختلف معاشرت، اور مختلف زبانوں والے صوبے تو کیا ملک کے ملک یکجا رہے اور مسلمان عیسائیوں سے بڑی سپر پاور رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اسلام کے فرض کردہ احکام سے غفلت میں مبتلا ہو کر مستحق سزا ہوئے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ۔ انہوں نے فریضۂ جہاد میں "الجھادُ ماضٍ" کے باوجود کوتاہی کی اور اَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ میں حد درجہ تقصیر کی تو کمزور ہو گئے اور کمزوری فطرت کی نظر میں قابلِ سزا جُرم ہے۔

مجھے ایک ذمّہ دار ریٹائرڈ افسر نے اپنے ایک سائنسدان عزیز کا واقعہ بتلایا کہ انہوں نے سہروردی کے سامنے گائیڈڈ میزائل کا فارمولا پیش کیا، مگر وہ غفلت کی نذر ہو گیا۔ اگر ہم غیر ملکی طاقتوں پر ناجائز حد تک اعتماد نہ رکھتے تو ہم بھی ایجاداتِ حربیہ میں آج ان کے ہم پلہ ہو سکتے تھے۔ (جاری ہے)

مولای صل وسلم دائما ابدا　　علی حبیبک خیر الخلق کلھم

درسِ حدیث

استاذ العلما، شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ کے زیرِ اہتمام ہر اتوار کو نماز مغرب کے بعد جامعہ مدنیہ میں مجلسِ ذکر منعقد ہوتی تھی۔ ذکر سے فارغ ہو کر حضرت رحمہ اللہ حدیث شریف کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ ذکر و بیان کی یہ مبارک اور رُوح پرور محفل کس قدر جاذب و پُرکشش ہوتی تھی الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔

محترم الحاج محمود احمد عارف رحمہ اللہ کی خواہش و فرمائش پر عزیز بھائی شاہد صاحب سلمہٗ نے حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کے بہت سے دروس ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر لیے تھے اور پھر دروس والی تمام کیسٹیں اُنہوں نے مولانا سید محمود میاں صاحب کو عطا کر دیں۔

ہماری دُعا ہے کہ جن کی مہربانی، توجہ اور سعی سے یہ انمول علمی جواہر ریزے ہمارے ہاتھ لگے، حق تعالیٰ اُن سب کو بیش از بیش اجر سے نوازے۔ ہم ان شاء اللہ تعالیٰ یہ قیمتی لؤلؤ لالا "انوارِ مدینہ" کے ذریعہ حضرت رحمہ اللہ کے مریدین و احباب تک قسط وار پہنچاتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ حضرت کے خلفِ اکبر اور جانشین حضرت مولانا سید رشید میاں صاحب کے زیرِ اہتمام ذکر و درس کا یہ سلسلہ بفضلہ تعالیٰ اب بھی جاری ہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان است　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان است

کیسٹ نمبر ۸ سائڈ اے - ۲۶ مارچ ۱۹۸۲ء

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وّ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

اَمَّا بَعْدُ! عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ فَلَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَھَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِھِمْ وَلَا نَصِیْفَہٗ[1]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہ کو بُرا نہ کہو، کیونکہ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا (اللہ کے راستے میں) خرچ کرے تو وہ (اجر و ثواب میں) صحابہ کے خرچ کیے ہوئے ایک مد بلکہ اس کے آدھے کو بھی نہیں پہنچے گا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مناقب اُن کے درجے حدیث شریف میں آئے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ میرے صحابہ کو بُرا نہ کہو لَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَھَبًا۔

---

[1] (مشکوٰۃ ص ۵۵۳)

اگر تم میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرتا یا خرچ کرے مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ تو وہ صحابہ کرامؓ کے ایک مُد کے برابر بھی نہیں پہنچے گا، بلکہ اس کے آدھے کو بھی نہیں پہنچے گا۔

مُد تو چھوٹا پیمانہ ہے یعنی ایک صاع کا چوتھائی حصّہ۔ تقریباً ساڑھ تولے کا ایک پیمانہ جیسے، وہ مُد ہے۔

واقعہ ایسے ہوا تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ میں کسی بات پر گفتگو ہو گئی تھی، تلخی ہو گئی تھی، اس کی اطلاع پہنچی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو آپ نے یہ فرمایا کہ میرے جو صحابہ ہیں یعنی تم سے پہلے والے جو سابقین ہیں جنہوں نے سبقت کی، اسلام قبول کرنے میں پہل کی ان کا درجہ بہت بڑا ہے اور بعد کے آنے والے اگر اُحد پہاڑ کے برابر بھی خرچ کریں تو ان کا ساڑھ ستر تولے کا جو خرچ ہو گا اس کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اور ہو سکتا ہے جو مراد ہوں اس سے یعنی اُنہوں نے جو جو خرچ کیے ہیں اس کی برابر تم نہیں پہنچ سکتے جو بعد میں آئے ہو، تو صحابہ کرام میں دَرجے ہیں۔ پہلے والے اور بعد والوں میں اتنا فرق ہے تو جو ہم ہیں ہمارا تو درجہ ہی بہت بعد کا ہے۔

قرآنِ پاک میں آیا ہے لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَاتَلَ جو لوگ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور جہاد میں حصّہ لیا ان کے برابر وہ لوگ نہیں ہو سکتے جو فتح مکہ کے بعد آئے، مسلمان ہوئے اور جہاد میں حصّہ لیا تو جہاد میں حصّہ انہوں نے بھی لیا اور بعد والوں نے بھی لیا، لیکن اُن کے برابر درجہ ان بعد والوں کا نہیں ہو سکتا۔ اُولٰئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قَاتَلُوْا ؕ جن لوگوں نے پہلے خرچ کیا ہے اور جہاد میں حصّہ لیا ہے ان کا درجہ بعد میں آنے والوں سے بڑا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ کسی میں کوئی برائی ہو۔ نہیں وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ اللہ کا وعدہ سب کے ساتھ بھلائی کا اور اچھائی کا ہے، لیکن درجے درجے میں فرق ہو جاتا ہے۔ بعد میں آنے والے تو بہت ہو گئے اور پھر پوری دنیا میں مسلمان اور اسلام پھیلتا چلا گیا۔ اور جہاد کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ کر لاکھوں تک ہو گئی، لیکن ان کا درجہ ان سے بڑا تو نہیں جو بدر والے تھے۔ بدر والے تین سو تیرہ تھے صرف، لیکن موقع ایسا تھا یا اسلام چلتا اور یا اسلام رُک جاتا، ختم ہو گیا ہوتا۔ اس واسطے ان کا درجہ بہت بڑا ہے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دعا فرمائی تھی بدر کے موقع پر۔ اس میں یہ الفاظ تھے اَللّٰهُمَّ اِنْ تَشَاْ لَا تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ۔ اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جائے اَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَام یعنی ہم جو ہیں یہ صحابہ چھوٹی سی جماعت ہے اگر یہ زندہ رہ گئے تو تیری عبادت جاری رہے گی اور یہ نہ رہے زندہ سب ختم ہو گئے (تو تیری عبادت جاری نہ رہ سکے گی) ان کا لشکر تین گنا سے

زیادہ بڑا تھا اور مسلح تھا اور ہر طرح کی انہیں سہولت تھی اور اس میں اکڑ فوں والے، اکڑنے والے بہت بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ ان حضرات کے پاس تیرہ اور سترہ یعنی تیرہ تلواریں تھیں، سترہ نیزے تھے۔ بس اتنا کچھ تھا۔ بہت سے بہت باقی اینٹیں، پتھر، لکڑی، ڈنڈے انہی چیزوں سے لڑنا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہادری بھی ہے انتہا درجے کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع مل گئی تھی کہ ایسے لشکر آگیا ہے ادھر مقابلے میں مکے والوں کا تو آپ ایک حد تک فاصلے پر پہلے ہی ٹھہر گئے چھ سات میل پیچھے اور وہاں صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا ہے۔ آگے جائیں یا نہ جائیں، کیونکہ ہم جو نکلے ہیں گھر سے تو لڑنے کے ارادے سے نہیں نکلے۔ معلوم یہ ہوا تھا کہ کافروں کا قافلہ گزر رہا ہے اسے روکنے کے لیے نکلے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو گھروں سے نکال دیا اور ان کا مال اسباب اور ان کی جائداد وغیرہ سب ضبط کر لی اور لڑائی چھڑ گئی۔ جب لڑائی چھڑ جائے تو پھر دشمن کی حفاظت ہمارے ذمے نہیں ہے۔ دشمن خود اپنی حفاظت کرے، تو لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے انہیں گھر سے نکال دیا۔ ان کے مکان پر، سامان پر، دوکانوں پر کاروبار پر (قبضہ کر لیا) تمام چیزوں کو ضبط کر لیا مکہ والوں نے، اب مکہ والوں کا قافلہ ادھر سے گزر رہا تھا تو ان کے لیے بالکل درست تھا کہ اس قافلے کو روک کر پکڑ لائیں اسے اور سامان بھی لے لیں اور انہیں بھی گرفتار کر لیں، نکلے اس ارادے سے تھے ادھر انہوں نے بڑی تیزی دکھائی ہے فوراً اطلاع پہنچی اور اُدھر سے اِدھر لشکر آگیا تیار ہو کر۔ ایک ہزار آدمی ہوگا، ان کے پاس گھوڑے بھی اونٹ بھی تمام چیزیں اور سامانِ حرب، زرہ، خود، تیر، نیزے، ڈھال، تلوار تمام چیزیں تھیں، تو آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاع ملی کہ ادھر سے باقاعدہ لشکر آگیا ہے، پھر آپ نے ایک منزل پہلے (اس کو منزل کہہ لیں یا نہ کہیں منزل، بہرحال چھ سات میل کا فاصلہ ہے۔ وہ لوگ سامنے نہیں تھے بہت دُور تھے وہاں) روک لیا، آپ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا اور ان میں یہی بات رکھی کہ کیا خیال ہے تمہارا آگے بڑھیں یا یہیں سے ہٹ جائیں؟ کیونکہ ابھی سامنے تو نہیں گئے کہ کوئی کہے کہ بھاگ گئے۔ اس کو بدرِ صغریٰ بھی کہتے ہیں، آج کل غالباً اسے بدر صغری کہتے ہیں۔ چھوٹی بدر، وہاں آپ نے قیام فرمایا تھا۔ وہاں کچھ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں تو راستے ایسے پُرپیچ ہیں کہ سامنا تو تھا ہی نہیں وہاں۔

صحابہ کرام نے انتہائی بہادری کا ثبوت دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تیار ہیں اور جہاں آپ فرمائیں گے ہم وہاں فوراً جائیں گے۔ اگر آپ کہیں گھوڑے ڈال دو تو ہم گھوڑے ڈال دیں گے۔ جیسے دریا میں گھوڑے ڈال دو کہہ دیتے ہیں، تو رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کی اس بہادری کی باتوں سے خوشی ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم تو بہادری میں ان سب سے زیادہ بڑے تھے اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بہتر یہ نہیں لگتا کہ اس وقت نہ لڑیں پیچھے ہٹ جائیں، بلکہ ایسے ہوا جیسے یہ بات پسند آئی ہو۔ خوش ہوئے آپ اور پھر فرمایا چلیں، پھر آگے آگے گئے اور پھر لڑائی کی اور لڑائی سے پہلے یہ دعا فرماتے رہے۔ اس میں یہ بھی تھا کہ اگر تو چاہے کہ آج کے بعد تیری عبادت ہی نہ ہو۔ مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے تیری کوئی عبادت کرے تو تجھے کچھ دے نہیں رہا۔ اور تیری نافرمانی کرے تو تیرے سے کچھ لے نہیں رہا۔ وہ تیری ہی دنیا میں رہتا ہے۔ تیری ہی ہوا سے زندہ ہے تیرے ہی پانی سے زندہ ہے۔ تیری نعمتوں سے زندہ ہے۔ وہ کہیں تیرے بس سے باہر تو گیا ہی نہیں۔ کوئی چیز تیرے بس سے باہر نہیں، تو تجھے تو ضرورت ہے ہی نہیں نہ تعریف کی نہ عبادت کی اور نہ نافرمانی سے کسی کی کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ تو اے اللہ تو ایسا مت چاہ مطلب یہ تھا تو اگر چاہے تو آج کے بعد تیری کوئی عبادت نہ کرے، لیکن تو ایسا مت چاہ یہ معنی ہیں تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی جب ہوئی تو فتح حاصل فرمائی وہ (صحابہ کرام جو اس لڑائی میں شریک تھے) اہل بدر کہلاتے ہیں۔ ان کا درجہ سب سے بڑا ہے صحابہ کرام میں۔

نمبر ایک درجہ عشرہ بشرہ کا دس صحابہ کرامؓ کا اور ان کے بعد درجہ ہے اہل بدر کا۔ صحابہ کرامؓ میں ان سے بڑا درجہ اور کسی کا نہیں۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا یعنی بعد کے آنے والے صحابہ کرام کو کہ جو تم سے پہلے ہیں ان کا خیال کرو، ان کو کبھی برا نہ کہو اور ان کی تعظیم کرو۔ بعد کے آنے والوں کو منع فرما دیا (پہلے صحابہ کرامؓ کو برا کہنے سے) اور جسے منع کیا اور جس کا قصہ پیش آیا وہ بھی معمولی آدمی نہیں خالد ابن ولیدؓ ہیں اتنے بڑے آدمی پہلے سے صلاحیتیں تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قسط : ۴۲

مقاصدِ بعثت فرائضِ نبوّت اور تکمیل

دُعا اور قبولیّتِ دعا

حضرۃ شیخ الحدیث مولانا سید محمّد میاں رحمہ اللہ کی تصنیف لطیف سیرۃ مبارکہ محمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے چند اوراق

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو دل کی تمناؤں کے ترجمان دعائیہ کلمات یہ تھے جو زبان مبارک پر جاری تھے :

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ط

(سورۃ ۲ البقرہ آیت ۱۲۹)

اے ہمارے رب ! اٹھا ان میں سے ایک رسول انہیں میں کا۔ پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھا دے ان کو کتاب اور پکی باتیں اور ان کو سنوارے۔ (شاہ عبدالقادرؒ)

قبولیّتِ دعا

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۔

(سورۃ ۶۲ الجمعہ آیت : ۲)

وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں کا۔ پڑھتا ان کے پاس اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا اور سکھاتا کتاب اور عقل مندی۔ (شاہ عبدالقادرؒ)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي

ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (سورۃ ۳ آلِ عمران آیت ۱۶۴)

اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہیں میں کا۔ پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور سنوارتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات۔ (شاہ عبد القادرؒ)

و مے آموزد آن را۔ کتاب و علم (شاہ ولی اللہؒ)

دعا اور قبولیتِ دعا کے الفاظ پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے۔ حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کے مقاصد یہ تھے۔

تلاوتِ آیات اللہ۔ تعلیمِ کتاب اللہ۔ تعلیم الحکمۃ۔ تزکیہ

تشریح

تلاوت آیات اللہ

یتلوا علیھم کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ پڑھتا ہے ان پر آیتیں، لیکن پڑھنے ہی کے لیے فقط قرآت بھی آتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ پڑھو تو قرآت کا لفظ ہی لایا گیا اقرا باسم ربّك الذی خلق، مگر یہاں دعا میں بھی یتلو ہے اور قبولیتِ دعا میں بھی "یتلو" ہی ارشاد ہوا ہے۔ یعنی تلاوت کرتا ہے۔ تو کیا قرآت اور تلاوت میں کچھ فرق ہے۔

واقعہ یہی ہے۔ تلاوت اور قرآت میں فرق ہے۔ تلاوت کے معنی[1] صرف پڑھنے کے نہیں ہیں، بلکہ تلاوت میں عمل بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ پھر عمل بھی ایسا کہ تسلسل کے ساتھ ہوتا رہے۔ یعنی تلاوت میں صرف قول نہیں ہوتا، بلکہ "قول مع[2] سعی پیہم" یعنی جس طرح آپ آیتیں سنائیں گے ساتھ ساتھ عمل اور عمل کے تسلسل کا بھی مشاہدہ کرادیں گے۔ یعنی جس طرح یہ ایک معجزہ ہے کہ "ایک امّیؐ محض" جس نے عمرِ عزیز کے چالیس دور اس طرح گزارے

---

[1] یہ مقصد نہیں ہے کہ تلاوت قرآت اور پڑھنے کے معنی میں نہیں آتا۔ قرآن شریف میں بہت جگہ محض پڑھنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ واتل علیھم نبا ابنی ادم بالحق۔ نتلو علیك من نبا موسٰی و فرعون بالحق وغیرہ۔ مگر جب ماخذ کا لحاظ کیا جائے تو صرف قرآت کے معنی نہیں ہوتے، بلکہ کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے۔ تفصیل دوسرے حاشیے میں ملاحظہ فرمائیے۔

[2] تلاوت کا ماخذ "تلو" ہے جس کے معنی ہیں اتباع کرنا، پیچھے چلنا اس طرح کہ آپ میں اور جس کے پیچھے چل رہے ہیں اس کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو۔ تلاہ۔ تبعہ۔ متابعۃ لیس بینھم ما لیس منھا۔ و ذٰلك۔ یکون تارۃً بالجسم وتارۃ بالاقتدا

←

کہ پڑھنے پڑھانے سے ناآشنا تھا اس کو "اقرأ" کا حکم ہو رہا ہے اور وہ قرأت کر رہا ہے۔ اسی طرح اس معجزہ کے ساتھ یہ ایک عجیب و غریب مشاہدہ بھی ہے کہ پڑھ کر سنانے والا جو کچھ پڑھتا ہے وہ خود اس کی عملی تصویر بن جاتا ہے۔ یعنی پڑھنے کے ساتھ ایسا کردار بھی پیش کرتا ہے کہ آپ اس کے عمل سے بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

ارشادِ ربّانی ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ط اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا

(سورۂ اسراء آیت)

شاہ صاحبان کے الفاظ میں اُردو اور فارسی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

کھڑی رکھ نماز سورج کے ڈھلنے[1] سے رات کی اندھیری تک اور قرآن پڑھنا فجر کا۔ بیشک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو[2]۔ اور کچھ رات جاگتا رہ اس میں۔ یہ بڑھتی ہے تجھ کو۔ شاید کھڑا کرے تجھ کو تیرا رب تعریف کے مقام[3] میں۔ (شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ)

← فی الحکم و مصدر تلوٌ و تلو۔ وتارۃ بالقرأۃ او تدبر المعنی و مصدرہ تلاوۃ و القمر اذا تلاھا اراد بہ ھھنا الاتباع علی سبیل الاقتداء والمرتبۃ و ذالک انہ یقال ان القمر ھو یقتبس النور من الشمس۔ و ھو لھا بمنزلۃ الخلیفۃ (ثم قال) والتلاوۃ تختص باتباع کتب اللہ المنزلۃ تارۃ بالقرأۃ وتارۃ بالارتسام لما فیھا من امر و نھی و ترغیب و ترھیب او ما یتوھم فیہ ذلک و ھو اخص من القرأۃ فکل تلاوۃٍ قرأۃٌ ولیس کل قراءۃٍ تلاوۃ لا یقال تلوت رقعتک یقال فی القرآن فی شیءٍ اذا قرأتہ وجب علیک اتباعہ (المفردات فی غریب القرآن)

[1] یعنی کواکب پرستوں کے طریقہ کے برخلاف کواکب پرست طلوع آفتاب کے وقت آفتاب کی پوجا کرتے ہیں تو خدا پرستوں کی عبادت طلوعِ آفتاب سے پہلے ہوتی ہے یا زوال آفتاب کے بعد۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[2] یعنی دن اور رات کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں۔ وہ قرأت سنتے ہیں، کیونکہ وہ خود قرأت نہیں کر سکتے ان کا وظیفہ تسبیح و تحمید ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

[3] وہ تعریف کا مقام ہے شفاعت کا جب کوئی نہ بول سکے گا تب حضرتؐ عرض کر کر خلق کو چھڑا دیں گے تکلیف سے (موضح القرآن)

برپا دار نماز را ۔ وقت زوالِ آفتاب ۔ تا ہجومِ تاریکی شب ولازم گیر قرآن خواندن فجر را ۔ ہر آئینہ قرآن خواندن فجر را حاضر میشوند فرشتگان و در بعض شب بیدار باش بقرآن شب خیزی زیادہ شد برائے تو ۔ نزدیک است کہ ایستادہ کند ترا پروردگار تو بمقام پسندیدہ ۔ (شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ)

وحی الٰہی کے کلمات کو شمار کیجئے جو ان آیتوں میں ہیں کل تیس لفظ ہیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور کردار پر نظر ڈالیے تو دفترِ بے پایاں ہے ۔ پانچ فرض ۔ ان کے اجزائے ترکیبی قیام، رکوع سجدہ وغیرہ ۔ ان کے اوقات، پڑھنے کا انفرادی اور جماعتی طریقہ ۔ پھر ہر ایک کے ساتھ سنتیں، نفلیں ۔ اُن کے آداب اور طریقے جو احادیث کے سیکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب تلاوت کے معنی واضح کر رہے ہیں ۔

فریضہ نماز عام مسلمانوں کے لیے

چار وقت کی وہ نمازیں جن کا سلسلہ آفتاب ڈھلنے کے وقت سے شروع ہو کر اندھیری رات گئے تک رہتا ہے اور پانچویں وقت کی نماز (صبح کی نماز) جس میں قرآن شریف پڑھنے کی خاص تاکید ہے کیونکہ یہ "مشہود" ہوتا ہے ۔ یعنی اس وقت دن اور رات کے کارگزار فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے ۔ یہ پانچ نمازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح تمام مسلمانوں پر فرض ہیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پانچ نمازوں کے علاوہ آپ کے لیے ایک اور حکم بھی ہے فتہجّد بہ نافلۃً لّک "جس کے معنی حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے یہ کیے ہیں ۔ کچھ رات جاگتا رہ اس میں (نماز پڑھنے میں) یہ بڑھتی ہے تجھ کو ۔ یہ خاص طور پر آپ کے حق میں اضافہ ہے ۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ترجمہ کیا ہے ۔ شب خیزی زیادہ شد برائے تو ۔ گویا نماز تہجد بھی آپ پر فرض ہے ۔ یہ فرض اُمّت[1] پر نہیں ۔ اُمّت کے حق میں صرف سنّت ہے ۔ نہ پڑھیں تو کوئی گناہ نہیں، مگر آپ کے حق میں فرض[2] ہے ۔

---

[1] امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے وتر کو واجب قرار دیا ہے ۔ یہ بھی تہجد ہی کا حصہ ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صرف وتروں کے متعلق ہے کہ انّ اللہ امدّکم بالصّلوٰۃ ھی خیر لکم من حمر النعم الوتر جعلہ اللہ بین صلوٰۃ العشاء الیٰ ان یطلع الفجر (ترمذی شریف و ابوداؤد) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک نماز کا ایک اور اضافہ کر دیا ہے ۔ یہ نماز ایسی ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت (حمر النعم) سے بھی بہتر ہے ۔ یہ نماز وتر ہے جس کا وقت اللہ تعالیٰ نے نمازِ عشاء اور فجر کے درمیان مقرر کیا ہے ۔

[2] اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ نبوت کے دورِ اوّل میں جو حکم ہوا تھا قم اللیل الّا قلیلا (سورۂ مزمل) (باستثناء تھوڑی سی شب

←

اس خصوصیت کی علت اور حکمت بھی بیان کر دی گئی کہ آپ کو مقامِ محمود[1] کا منصب عالی عطا کرنا ہے

← کے تمام رات قیام کرو) وہ منسوخ نہیں ہوا کیونکہ اس کی جو علت یا حکمت بیان کی گئی تھی وہ آخر تک باقی رہی۔ حکمت یا علت یہ تھی کہ اس سے نفس پامال ہوتا ہے۔ قول اور فعل میں موافقت رہتی ہے اور دعا اور ذکر بہت ہی ٹھیک طرح ادا ہوتے ہیں انّ ناشئۃ اللّیل ھی اشد وطاً واقوم قیلاً (بیشک رات کے وقت اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور دعا ہو یا قرأت ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے) یہ آپ کی حیاتِ مقدس کا وہ جوہری جزو تھا جو ہمیشہ قائم رہنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ قائم رہا تو اس کو پیدا کرنے والا عمل یعنی قیام لیل وہ بھی لازم رہا۔ پھر ارشادِ ربّانی تہجد بہٖ نے اس کو اور پختہ کر دیا، کیونکہ جب اسی آیت میں بشارت دی گئی کہ آپ کو مقامِ محمود پہ مبعوث کیا جائیگا (عسی ان یبعثک ربّک مقاماً محموداً) اور یہ ظاہر کیا گیا کہ تہجد اس کا ذریعہ ہوگا تو ایک علّت اور حکمت کا اور اضافہ ہو گیا۔ اور مطلب یہ ہوا کہ آپ کی یہ خصوصیات ہیں کہ ہمیشہ نفس پامال (بتعبیر دیگر مطیع اور فرمانبردار) قول اور فعل میں مطابقت۔ ذکر اور دعا کی نہایت صحیح طرح سے ادائیگی اور مقام محمود پر آپ مبعوث فرمائے جائیں گے۔ یہ تمام خصوصیات قیام لیل پر مرتب ہوں گی، لہٰذا قیام لیل یعنی تہجد مخصوص طور پر آپ پر فرض رہیگا۔

البتہ یہ تخفیف ضرور ہوئی کہ پہلے حکم تھا کہ کم و بیش نصف شب قیام کرو۔ بعد میں یہ سہولت کر دی گئی کہ (قرأت سہولت کے مطابق کرو۔) فاقرءوا ما تیسر منہ

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تہجد اور وتر میں فرق کرتے ہیں۔ وہ تہجد کو عام مسلمانوں کے لیے سنّت قرار دیتے ہیں اور صرف وتر کی تین رکعت کو واجب قرار دیتے ہیں۔ امام صاحب کا استدلال احادیث سے بھی ہے جو پہلے حاشیہ میں بیان کی گئیں۔ اور استادِ محترم حضرۃ علامہ انور شاہ رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت امام صاحب کی دلیل قرآن پاک کی یہ آیتیں بھی ہیں جن میں قیام لیل کا حکم ہے (قم اللیل الاّ قلیلاً) یہ حکم جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رہا، امّت کے لیے بھی رہا منسوخ نہیں ہوا (چنانچہ لفظ جمع کے ساتھ ارشاد ہوا۔ فاقرءوا۔ تم پڑھو جس قدر میسر ہو، البتہ آپ کے لیے یہ تخفیف کی گئی کہ قرأت بقدر سہولت ہو اور امّت کو مزید سہولت یہ دی گئی کہ آخر شب کو بیدار ہونے کا یقین نہ ہو تو شروع شب میں وتر کی تین رکعتیں پڑھ لیں جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خطرہ ہو کہ آخر شب میں نہیں اٹھ سکیں گے تو اوّل شب میں وتر پڑھ لیں۔ (مسلم شریف ص۲۵۸ ج۱)

بایں ہمہ یہ نظر انداز نہ ہونا چاہیئے کہ حضراتِ علماء کا ایک قول یہ بھی ہے کہ تہجّد آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نفل کا درجہ رکھتا تھا۔ آپ پر فرض نہیں تھا۔ مگر یہ صرف علمی نکتہ سنجی ہے، ورنہ عمل کے لحاظ سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم اسی طرح پابند رہے۔ جیسے فرائض کے (واللہ اعلم بالصواب)

[1] مقام محمود۔ یحمدہ اھل الجمع کلھم یعنی میدانِ حشر میں جمع ہونے والی ساری مخلوق آپ کی تعریف کرے گی (بخاری شریف)

←

عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (سورۂ ۱۷ بنی اسرائیل آیت ۷۹) قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچائے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو۔ جس کی ہر طرح تعریف کی جائے۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

یہ ایک عام اصول ہے۔ یہاں یہی ظاہر کرنا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح یہ مقامِ عالی ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" اسی طرح آپ کے فرائض میں بھی اضافہ[1] ہے اور ایسا اضافہ کہ عام انسانوں کو یہ حوصلہ نہیں ہے کہ اس اضافہ کو برداشت کر سکیں۔ یہ حوصلہ بھی رَبِّ محمدؐ نے صرف محمدؐ ہی کو عطا فرمایا تھا۔ جس نے اس اضافہ کو برداشت[2] کیا۔ (صلوٰت اللہ علیہ دائمًا ابدًا)

بسلسلہ عبادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات

نماز کے سلسلہ میں صرف یہی نہیں کہ تہجد آپ پر فرض تھا، بلکہ تہجد کے علاوہ بھی اور نوافل آپ کے حق میں فرض کا درجہ[3] رکھتی تھیں۔

یہ اس لیے کہ آپ پوری مخلوق کے لیے شفاعت کریں گے اور آپ کی سفارش قبول ہوگی۔ احادیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ میدانِ حشر میں پوری مخلوق جمع ہوگی اور منتظر ہوگی کہ اس کا حساب ہو اور ان کے حق میں فیصلہ ہو۔ ایک دراز مدت اس کے انتظار میں گزر جائیگی۔ اہلِ ایمان کو اس کی درازی اتنی محسوس نہیں ہوگی، مگر اہلِ کفر کے لیے یہ درازی خود مصیبت بن جائے گی تو اب کسی ایسے مقرب بارگاہ کی تلاش ہوگی جو حضرت حق جل مجدہٗ سے سفارش کرے کہ حساب کر کے ان کا معاملہ طے کر دیا جائے۔ مخلوق حضرت آدم، حضرت ابراہیم اور دیگر اکابر انبیاء (علیہم السلام) کے پاس دوڑے گی کہ وہ شفاعت کریں گے، مگر تمام انبیاء علیہم السلام معذرت کر دیں گے۔ اور حضرت خاتم الانبیاء علیہم السلام کا نام لیں گے۔ تب مخلوق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرے گی۔ آپ بارگاہِ الٰہی میں حمد و ثنا کرتے ہوئے سجدہ کریں گے اور پوری مخلوق کے لیے سفارش کریں گے تو حساب شروع ہوگا۔ (بخاری و ترمذی شریف وغیرہما) اس ساری مخلوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سفارش سے بہرہ اندوز ہوگی۔ اس کو شفاعتِ کبریٰ کہا جاتا ہے۔

[1] مگر یہ اضافہ عجیب قسم کا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ تو معصوم و مغفور ہیں پھر یہ ریاضت کیوں کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا ہے تو آپ نے جواب دیا۔ افلا اکون عبدًا شکورًا کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں (بخاری شریف ص۱۶۲) یعنی اہلِ کے لیے فرضیت اس لیے ہے کہ گناہوں کا کفارہ ہو اور آپ کے لیے فرضیت بر بنا شکر ہے۔ اسی لیے نفلیں جو شکر ادا کرنے کے لیے ہوتی ہیں وہ آپ کے حق میں فرض ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[2] و [3] ←

روزہ نماز کے علاوہ روزے کے بارے میں خصوصیت یہ تھی کہ چند روز کا مسلسل روزہ کہ بیچ میں افطار قطعاً نہ ہو امّت کو اس کی اجازت نہیں، مگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔

ایک مرتبہ صحابہ کرام نے اصرار کر کے اجازت[1] حاصل کی اور مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا، مگر صرف دو روز بعد ہی اندازہ ہوگیا۔

؎ نہ ہر جائے[2] مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن

حضراتِ علماء نے روزے کے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ (۱) عوام کا روزہ یعنی فقہی قاعدوں کے مطابق کھانے پینے وغیرہ سے رکنا اور مکروہات و محرومات یعنی غیبت، جھوٹ، خیانت، حسد، مکر و فریب

← [2] برداشت کرنے کی صورت ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نیّت باندھنے میں آپ نے تین دفعہ اللہ اکبر فرمایا پھر فرمایا۔ ذوالملکوت والجبروت والکبریاء والعظمۃ (مالک ملک۔ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک۔ بڑائی اور عظمت والا) پھر قرأت شروع کی تو پوری سورۂ بقرہ نہایت اطمینان سے پڑھی۔ پھر اسی کے مناسب بہت طویل رکوع کیا۔ پھر اتنا ہی طویل قیام کیا پھر اتنا ہی طویل سجدہ کیا۔ سجدہ کے بعد بڑے اطمینان سے دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر دوسرا سجدہ کر کے کھڑے ہوئے تو سورۂ آلِ عمران پوری پڑھی۔ تیسری رکعت میں سورۂ نساء مکمل چوتھی رکعت میں سورۂ مائدہ یا سورۂ الانعام پوری پڑھی۔ صحابی کے بعد کے راوی شعبہ کو شک ہے کہ کونسی سورت کا نام لیا تھا (ابوداؤد باب مایقول فی الرکوع) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا بھی کرتے تھے کہ تین دفعہ میں تہجّد پڑھا کرتے تھے۔ یعنی ایک مرتبہ اٹھے وضو کیا، مسواک کی، نفلیں پڑھیں پھر آرام فرمایا۔ تھوڑی دیر تک سوتے رہے پھر اٹھے اس طرح تین دفعہ سوئے پھر اٹھے اور نوافل پڑھتے رہے (مسلم شریف) ظاہر ہے بار بار اٹھنا کتنا شاق ہوتا ہے۔ پھر تلاوت کی صورت حضرت عائشہ اور حضرت امِّ سلمہ رضی اللہ عنہما نے یہ بیان فرمائی کہ ایک ایک حرف الگ الگ کھینچ کر (بخاری شریف، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آخر میں آپ تہجد کی نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے، مگر صورت یہ ہوتی تھی کہ پہلے بیٹھ کر پڑھتے رہتے جب تیس چالیس آیتیں رہ جاتیں تو کھڑے ہو کر پڑھتے۔ پھر رکوع کیا کرتے تھے (بخاری شریف ص۱۴۵ و ص۱۵۱ وغیرہ)

[3] مثلاً ظہر کی سنتیں اگر وقت پر نہ پڑھی جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے، لیکن ایک مرتبہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی ظہر کی سنتیں رہ گئیں تو آپ نے نمازِ عصر کے بعد ان کو پڑھا۔ بخاری شریف ص۱۶۴ و ص۱۶۵ پھر ان کو معمول بنا لیا بخاری شریف ص۸۳ حالانکہ نمازِ عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک اور نمازِ صبح کے بعد سے طلوع آفتاب تک نوافل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے بخاری شریف ص۸۳، مگر چونکہ آپ کے حق میں نوافل فرض کا درجہ رکھتی تھیں، لہٰذا آپؐ نے عصر کے بعد یہ نفلیں پڑھیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

---

[1] بخاری شریف ص۲۶۳ باب التنکیل لمن اکثر الوصال [2] ہر جگہ گھوڑے نہیں دوڑائے جا سکتے۔ بہت سی جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہاں سپر ڈال دینا چاہیئے۔

وغیرہ سے اجتناب واحتیاط۔

(۲) خواص کا روزہ۔ یعنی صرف مکروہات ومحرومات سے اجتناب نہیں، بلکہ ایسی جائز چیزوں سے بھی احتیاط برتی جائے جو یادِ خدا سے غافل کردیں۔ مثلاً شعر وشاعری یا شکار وغیرہ۔

(۳) اخص الخواص کا روزہ۔ اللہ کے سوا ہر چیز سے یکسوئی اور برطرفی اور صرف ذاتِ حق جل مجدہٗ میں محویت اور اس کی ذات وصفات میں ایسی مشغولیت کہ وہی جملہ توجہات کا محور ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روزے کی یہی شان ہوتی تھی اور یہ شان نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ جب آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ۔

ترجمہ: مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ پس خلقِ خدا میں اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے عیال پر احسان کرے۔[1]

عجیب وغریب بات یہ ہوتی تھی کہ جس طرح توجہ الی اللہ اور ذاتِ حق میں انہماک بڑھتا تھا اتنا ہی اس کی مخلوق کے حق میں رحم وکرم اور جود وسخا کا درجہ بڑھتا تھا یعنی پروردگار کی محبّت اس کی پروردہ مخلوق پر لطف واحسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شہادت ملاحظہ فرمائیے:

کان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اجود الناس کان اجودھا یکون فی رمضان حین یلقاء جبرئیل وکان یلقاہ فی کل لیلۃٍ من رمضان فیدارسہ القرآن فلرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود بالخیر من الریح المرسلۃ[2]

(یعنی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے اور آپ کی بے پناہ سخاوت کا زیادہ ظہور رمضان میں ہوتا تھا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملاقات کیا کرتے تھے اور حضرت جبرئیل کی ملاقات رمضان شریف کی ہر ایک رات میں ہوتی تھی۔ وہ آپ سے قرآن شریف کا دَور کیا کرتے

---

[1] مشکوٰۃ شریف از شعب الایمان للبیہقی باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق

[2] بخاری شریف ص۳ و ص۲۵۵ وغیرہ۔

تھے۔ بس واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت اور بخشش جو سال بھر نسیم صبح رہتی تھی اس زمانہ میں وہ آندھی سے زیادہ تیز ہو جاتی تھی۔ جس کے جھونکے کسی رکاوٹ کے پابند نہیں ہوتے ہر طرف پہنچتے ہیں اور ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں۔

زکوٰۃ امت کے لیے ایک نصاب معین کیا گیا کہ اس سے کم پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہوتی اور جب واجب ہو جاتی ہے تو صرف چالیسواں حصہ دینا ہوتا ہے۔ باقی سب مال حلال و مباح، بلکہ پاکیزہ اور طیب، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور العمل پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے طے فرما لیا تھا کہ کاشانۂ نبوت سونے چاندی سے پاک رہے گا۔ دینار تو دینار درہم کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ دولت کدہ پاک میں رات گذار سکے۔[ع]

جہاد کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کے لیے زحف عن القتال (یعنی جنگ کے وقت میدانِ جنگ سے بھاگ جانا) حرام ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ تھی کہ ابھی دولت کدہ سے بھی نہیں نکلے صرف ہتھیار سجائے ہیں۔ اس وقت ہر ایک مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ اسلحہ اتار دے اور موقع ہو تو ارادۂ جنگ بھی ملتوی کر دے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیار سجانے کے بعد جائز نہیں سمجھتے[1] تھے کہ اسلحہ اتار دیں۔ جب تک فیصلہ کن جنگ نہ کر لیں۔

غرض یہ کردار تھا جس کو پیش کرتے ہوئے آپ آیات اللہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ جو قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے وہ آپ کے عمل سے آیات اللہ کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

خلاصۂ کلام "تلاوت آیات اللہ کی تشریح کو ہم تبرکاً شہیدِ وفا عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے اشعار پر ختم کرتے ہیں ؎

(۱) وفینا رسول اللہ یتلو کتابہ — اذا انشق معروف من الفجر ساطع

(۲) ارانا الھدی بعد العمی فقلوبنا بہ — موقنات ان ما قال واقع

(۳) یبیت یجافی جنبہٗ عن فراشہ — اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

ترجمہ: (۱) ہمارے بیچ میں اللہ کے رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کتاب اللہ کی تلاوت اس وقت کرتے ہیں جب کہ وہ معروف اور جانی پہچانی شئی جو روشن ہوتی ہے جس کو فجر کہتے ہیں شق ہوتی ہے۔ (پو پھٹتی ہے)

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۱۳ ج۴ [2] وہ جانثار اور فداکار جو غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے۔

[ع] اس سلسلہ میں مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے کہ کس طرح سب کچھ خرچ کر کے فاقہ اختیار کیا جاتا تھا۔

(۲) اس اللہ کے رسول نے ہمیں نابینائی (گمراہی) کے بعد ہدایت کا راستہ دکھلایا۔ پس ہمارے قلوب اس کا یقین رکھتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ ہو کر رہے گا۔

(۳) یہ اللہ کے رسول اس طرح رات گزارتے ہیں کہ آپ کا پہلو بستر سے الگ رہتا ہے (خاص) اس وقت جبکہ مشرکین (بستر پہ دراز ہوتے ہیں اور) بستران کے جتھوں سے بوجھل ہوتے ہیں۔

تعلیم الکتاب

یعلمھم الکتاب

ہزاروں فتاویٰ اور فیصلے جن سے ملّتِ اسلامیہ کے اہلِ علم حضرات فقہاء استدلال کرتے ہیں اور غیر مسلم فضلاء کے لیے شمع بصیرت ہیں وہ انہیں غیر متمدن اور پسماندہ کاشت کاروں یا چرواہوں کے ارشاد فرمودہ ہیں جن کی پس ماندگی کا شاہِ ایران مذاق اڑایا کرتا تھا اور خود مکہ کے سردار ان کو حقیر سمجھتے تھے یہاں تک کہ ابوجہل کو جان کنی کے وقت صدمہ تھا تو یہ تھا کہ اس کو مدینہ کے کسانوں نے مارا یا ان کے ارشادات و فرمودات ہیں جو مکہ کے معمولی دوکاندار تھے اور تحقیق کی جائے تو ان میں کچھ وہ بھی تھے جو رہزنی کیا کرتے تھے اور کچھ وہ تھے کہ بقول علامہ حالی ؎

تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی غرض ہر طرح ان کی حالت بُری تھی

ان حضرات نے نہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی نہ کسی دارالعلوم یا دارالافتاء سے استفادہ کیا تھا۔ ان کی تعلیم گاہ و تربیت گاہ اسی ہادیٔ اعظم کی خس پوش مسجد تھی جس کو رب العرش نے تعلیم کتاب کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔

پھر ان میں سے ۲۳ سالہ دورِ نبوّت کے رفقاء تو چند ہی تھے جن کی تعداد چالیس بھی نہیں تھی۔ مدینہ طیبہ کا دس سالہ دَور بھی سب کو نصیب نہیں ہوا۔ بہت[1] سے وہ تھے جن کو دو تین سال اور بعض[2] وہ تھے جنکو چند ماہ ہی میسّر آئے، مگر اخذ و استنباط کی وہ غیر معمولی بصیرت نصیب ہوگئی کہ یونیورسٹیوں اور دارالعلوموں کے تعلیم یافتہ فضلاء ان کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتے۔

بصیرت کے ساتھ جو وسعتِ ذہن میسر آئی وہ بھی پیغمبرانہ تربیت کی برکت تھی۔ یعنی جس طرح وہ خود اخذ و استنباط سے کام لیتے تھے وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اسیطرح اخذ و استنباط کا حق دوسرے کو بھی ہے۔ وہ جس طرح اپنی رائے کا

---

[1] جیسے ابوہریرہ۔ ابوموسیٰ اشعری، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم [2] جیسے جریر بن عبداللہ بجلی رضی

احترام کرتے تھے، دوسرے کے فیصلے کا بھی اسی طرح احترام کرتے تھے۔

چنانچہ جن اجتہادی مسائل میں آج اختلاف ہے حضراتِ صحابہ کے دور میں بھی یہ اختلاف تھا۔ اسی لیے ہر ایک فریق کے پاس جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے۔ کسی صحابی کا قول یا فیصلہ بھی وہ اپنے خزینۂ یادداشت میں محفوظ رکھتا ہے، مگر باہمی تصادم سے یہ حضرات محفوظ تھے اور سبق آموز بات یہ ہے کہ نہ باہمی رشک و حسد تھا نہ شوق تعلی نہ جذبۂ برتری۔ تحقیقِ مسئلہ کے وقت کھلے طور پر تنقید اور جرح، مگر وقتِ نماز آگیا تو جماعت میں سب شریک۔ بسا اوقات امام وہی بنا جو نشانۂ اختلاف تھا۔

مثال ہم فقہ پڑھتے ہیں۔ پڑھاتے ہیں۔ رات دن کے معاملات میں مسائل فقہ پر عمل کرتے ہیں، لیکن اگر ایسا اتفاق ہو جائے کہ امام مثلاً صبح کی نماز میں آیت سجدہ پڑھ لے پھر سجدہ کرے تو تقریباً ہر ایک مقتدی وقفِ انتشار ہو جاتا ہے۔ کوئی سجدہ میں پہنچ جاتا ہے کوئی رکوع میں امام کا انتظار کرتا ہے، لیکن تحویلِ قبلہ کی آیت نازل ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی۔ مسجد بنی عبدالاشہل اور اسی طرح مسجد قبا میں جماعتیں ہو رہی تھیں۔ اسی حالت میں خبر دینے والے نے خبر دی تو فوراً پوری پوری صفوں کا رُخ شمال کی جانب سے جنوب کی طرف پھر گیا۔ مردوں کی جگہ عورتوں کی صف پہنچ گئی، مگر یہ سب تبدیلی نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ اس طرح ہو گئی گویا ان کو پہلے سے اس کی مشق کرائی جا چکی تھی، حالانکہ مشق تو کیا مشق کا کبھی تصوّر بھی نہیں کیا گیا تھا۔

نمازِ صبح کے وقت حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ قرأت کر رہے تھے کہ ایک بدبخت نے خنجر مارا۔ فاروقِ اعظم رضؓ نے گرتے گرتے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر مصلّے پر کھڑا کیا۔ حملہ آور کو صف اوّل کے لوگوں نے پکڑنے کی کوشش کی۔ ۱۳ آدمی زخمی ہوئے تب اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر یہ انتشار جو کچھ بھی ہوا صرف صفِ اوّل میں امام سے متصل بعد کی صف والوں کو اتنا پتہ چلا کہ نماز پڑھانے والے فاروقِ اعظم رضؓ نہیں ہیں کوئی اور شخص نماز پڑھا رہا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بہت اختصار سے نماز پڑھ کر سلام پھیر دیا۔ تب لوگوں کو صورتِ حال کا علم ہوا[1]

یہ تھا تعلیم الکتاب کا ایک رُخ اور حضراتِ صحابہ پر اس کا اثر۔

---

[1] بخاری شریف ص ۵۲۳

ادارہ انوارِ مدینہ کی جانب سے رسالہ میں شیخ الاسلام حضرت اقدس مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کی تقاریر شائع کرنے کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کے متوسلین و خدام سے اپیل ہے کہ اگر ان کے پاس حضرت کی تقاریر ہوں تو ادارہ کو ارسال فرما کر عند الناس مشکور اور عند اللہ ماجور ہوں۔ (ادارہ)

حقیقتِ حج

ذیل میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرّہٗ کی وہ تقریر درج کی جارہی ہے جو حضرت ممدوح نے سفرِ حجاز میں تشریف لے جاتے ہوئے محمّدی جہاز میں مسافرانِ جہاز کے سامنے فرمائی تھی۔ یہ تقریر ہفت روزہ خدّام الدّین مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ (ادارہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہونا میں فضول اس وجہ سے سمجھتا تھا کہ بڑے بڑے حضرات موجود ہیں اور ان کی تقاریر برابر ہوتی رہی ہیں۔ میں نہ اعلیٰ درجے کی تقریر کر سکتا ہوں اور نہ اس میدان کا ماہر ہوں اور اب میں کمزور بھی ہو گیا ہوں، مگر مجھ کو بار بار حکم دیا گیا اس لیے کچھ روشنی عبادتِ حج کے متعلق ڈالنا چاہتا ہوں۔

میرے بزرگو! تمام عالم میں ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ آزاد رہے۔ دوسرے کا تابعدار ہو کر نہ رہے۔ کسی کی تابعداری اس وقت ہوتی ہے جبکہ تابعداری پر مجبوری ہو۔ تابعداری کے تین اسباب ہیں:

(۱) ایک یہ کہ نفع کی امّید ہو۔ بادشاہوں اور مالکوں کی تابعداری اسی وجہ سے کی جاتی ہے کہ وہ نفع پہنچائیں گے اور حاجت رفع کریں گے۔

(۲) دوسرا سبب نقصان کا اندیشہ ہے یعنی کسی شخص سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہو کہ مارے گا، پیٹے گا، اگر اس کی تابعداری نہ کی تو اس سے نقصان پہنچے گا۔

(۳) تیسرا سبب تابعداری کا محبّت ہے۔ کسی سے محبّت ہو تو اس کی محبّت کی وجہ سے اس کی تابعداری

کی جاتی ہے۔ محبوب اگرچہ کمزور ہو۔ اس سے نفع کی اُمید ہو نہ نقصان کا اندیشہ۔ دیکھو ماں باپ اولاد کی تابعداری کرتے ہیں۔ بچے جو مطالبہ کرتے ہیں ماں باپ اس کو پورا کرتے ہیں۔ صرف محبّت کی وجہ سے ماں باپ بچے کی تابعداری کرتے ہیں اس کی ہر بات کو مانتے ہیں اور اس کی پرورش کرتے ہیں حالانکہ ان کو بچہ سے نفع کی کوئی امّید نہیں نہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ محبّت کا تقاضا ہے کہ انسان محبوب کی تابعداری کرے۔

شاعر کہتا ہے ؎

اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُحِبُّ مُطِیْعٌ

تم اللہ کی محبّت کا دعویٰ کرتے ہو اور اس کے حکم کے خلاف کرتے ہو یہ محبّت کے قانون کے خلاف ہے۔ عاشق کی تو نشان یہ ہے ؎

یُدَارِیْ هَوَاهُ ثُمَّ یَکْتُمُ سِرَّهٗ
وَ یَخْشَعُ فِیْ کُلِّ الْاُمُوْرِ وَیَخْضَعُ

حاصل کلام یہ ہے کہ تابعداری کے یہی تین اسباب ایک کو دوسرے کی تابعداری پر مجبور کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ میں یہ تینوں اسباب بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اس قدر نفع کی اُمّید ہے کہ دنیا میں کسی سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کا مربّی، سب کا نگران، سب کا پیدا کرنے والا اور سب کا پالنے والا ہے۔ کتنا ہی بڑا بادشاہ ہو اس قدر نفع نہیں پہنچا سکتا۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ، مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ط

جسے چاہتا ہے شہنشاہ بنا دیتا ہے، جسے چاہتا ہے غریب رکھتا ہے۔ سب کچھ اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں سب اسی کی ہیں۔ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ اس کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔ اس کی نعمتیں جو تم کو مل رہی ہیں ان گنت اور بے شمار ہیں۔ تم جو مانگتے ہو وہ تم کو دیتا ہے وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ اس لیے اللہ تعالیٰ سے نفع کی اُمّید جتنی تمام مخلوق کو ہے اور ہو سکتی ہے اتنی اور کسی سے نہیں۔ ہم دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی میں اللہ ہی کے محتاج ہیں۔ وہ ہر چیز کو محیط ہے۔ مطلع ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے خارج نہیں۔ اسی طرح نقصان کا اندیشہ جتنا اس سے ہے اور کسی سے نہیں۔ جا بجا ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جتنے تمہارے معبود ہیں

اُن سب کے اندر نہ مالکیت نفع کی ہے نہ مضرت کی ۔ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَالَا یَنْفَعُکُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّکُمْ ۔ خدا کے سوا کسی سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ۔ اگر اللہ کسی کو نفع پہنچانا چاہے اور تمام مخلوق مل کر اس کو نقصان پہنچانا چاہے تو نقصان نہیں پہنچ سکتا اور اگر خدا کسی کو نقصان پہنچانا چاہے اور سارا جہان مل کر اس کو نفع پہنچانا چاہے تو نفع نہیں پہنچ سکتا ۔ حقیقۃً نفع کی اُمید اور نقصان کا اندیشہ اسی سے ہے جسے چاہے نواز دے ، جس کو چاہے بادشاہ بنادے ، جس کو چاہے مریض بنادے ۔ مالک الملک ہے ۔ جسے چاہے ہر طرح کی نعمتوں سے مالامال کردے جسے چاہے مصیبت میں ڈال دے جسے چاہے مصیبتوں سے نجات دیدے ۔ ہر چیز کا جاننے والا ، ہر ایک کو پالنے والا وہی خداوند کریم ہے ۔ صفت مالکیت کی وجہ سے جنّات اور ملائکہ پر بھی اس کی تابعداری ضروری ہے ۔ اس کی صفتِ مالکیت کا تقاضا ہے کہ ہمیشہ اس کی تابعداری کی جائے ، کیونکہ اس کو اگر راضی کیا جائے گا تو ہر قسم کی نعمتیں پہنچیں گی اور اگر اس کو ناراض کیا جائیگا تو ہر ایک نقصان کا اندیشہ ہے ۔ تیسری وجہ تابعداری کی محبّت ہے ۔ محبّت کے چار اسباب ہوتے ہیں ۔

کمال[۱] ، جمال[۲] ، احسان[۳] ، قرب[۴] ۔

(۱) کسی میں کوئی کمال ہوتا ہے تو اس سے اس کمال کی وجہ سے محبّت کی جاتی ہے ۔ ع

"کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی"

اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز میں جس قدر کمال رکھتا ہے دوسرا کوئی نہیں رکھ سکتا ۔

(۲) دوسرا سبب جمال ہے ۔ حُسن و جمال بھی محبّت کا سبب ہوتا ہے ۔ سُورج ، چاند ، ستارے ، فرشتے ، اور انسانوں میں مرد اور عورت میں جو بھی حُسن اور جمال پایا جاتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے ۔ ظاہر ہے کہ دینے والا وہی چیز دے سکتا ہے جو خود اس کے پاس موجود ہو ، جبکہ ہر ایک شے میں جو کچھ بھی حسن و جمال ہے وہ سب خدا ہی کا دیا ہوا ہے تو خود خدا کے اندر حُسن و جمال کا ہونا ، بلکہ سب سے زیادہ اور سب سے اکمل و اعلیٰ درجہ کا ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے ۔ اِنَّ اللّٰہَ جمیل و یحبُّ الجمال ۔ کسی میں کوئی جمال ہے تو اس کا مبدا ذات باری تعالیٰ ہے ۔ چودھویں رات کے چاند میں جو جمال ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ہے ۔ حیوانات ، جمادات ، فرشتے ، انسان ، مرد اور عورتوں میں جو بھی حسن و جمال ہے وہ سب اسی کا ہے ۔ جس مخلوق میں تھوڑا سا بھی حُسن ہوتا ہے اس پر فریفتہ ہوتے ہیں ۔ چکور کو چودھویں رات کے چاند سے محبّت ہے ۔ بُلبُل کو گل سے ۔ وہ خدا جس نے سب کو حسن و جمال عطا فرمایا ہے خود اس میں جتنا حسن و جمال ہے کسی چیز میں نہیں ۔

(۳) تیسرا سبب محبت کا احسان ہے۔ اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ۔ کیا اللہ تعالیٰ کے احسان کے برابر کسی کا احسن ہو سکتا ہے۔

کیا اللہ جیسا محسن کوئی ہو سکتا ہے۔ ماں باپ کو دیکھئے کہ ان کا احسان اپنی اولاد پر جتنا ہوتا ہے کسی کا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ اللہ کی صفتِ خالقیت کے مظہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہر انسان، بلکہ ہر مخلوق پر جس قدر ہے کسی کا بھی نہیں۔ ہم کو ہمارے ماں باپ کو وجود سے نوازا۔ دیکھنے چلنے پھرنے کی طاقت سب اس نے دی۔ خدا کا احسان ہر مخلوق پر جب سب سے زیادہ ہے تو چاہیئے کہ اس سے محبت بھی سب سے زیادہ اور اعلیٰ درجہ کی ہو۔ اس جیسی محبت کسی دوسرے سے نہ ہو۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کا احسان کتنا بڑا ہے کہ اس کو پیدا کرنے سے پہلے زمین و آسمان اور اس کی راحت کے تمام ساز و سامان پیدا کر دیئے۔ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ یعنی انسان کو پیدا کرنے سے پہلے ہی اس پر احسانات کی بارش فرمائی۔ پیدا کرنے کے بعد اس قدر احسانات کیے کہ ان کا احاطہ اور شمار ممکن نہیں وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ تمام چیزوں کو تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔ خلق لکم ما فی الارض جمیعا۔ اور صرف پیدا ہی نہیں کیا، بلکہ سب چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً۔ یہ سب کے سب تمہاری اطاعت کرتے ہیں، تمہاری خدمات میں لگے ہوئے ہیں۔ بیگار میں۔ کوئی تم سے اپنی خدمات کی مزدوری طلب نہیں کرتا۔ بغیر اُجرت کے شب و روز تمہاری خدمات میں ہر ایک مخلوق لگی ہوئی ہے۔ چاہے آسمان میں ہو یا زمین میں۔ یہاں تک کہ فرشتے تمہاری خدمات کرتے ہیں۔ فرشتوں میں اعلیٰ درجے کے مقرب فرشتے حاملینِ عرش بھی تمہارے لیے مسخر ہیں اور شب و روز دعا گوئی کرتے ہیں: اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

یہ فرشتے تمہارے لیے، تمہارے اولاد کے لیے، تمہاری بیویوں کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ اسی طرح سے

اللہ تعالیٰ نے عام فرشتوں کو تمہارے لیے مسخر اور تابعدار بنا دیا۔ وہ تمہاری خدمات کرتے ہیں، تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔ بادلوں کو چلانا، پہاڑوں کی حفاظت کرنا، دریاؤں کو چلانا یہ سب کام ان کے ذمے ہیں اور یہ ساری خدمات مفت بلا معاوضہ کرتے ہیں۔ تم سے اس پر تنخواہ یا اُجرت اور مزدوری نہیں طلب کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان انسان پر بالخصوص مسلمانوں پر جس قدر ہے اتنا کسی پر نہیں۔ اس لیے اگر احسان کی وجہ سے محبّت کی جائے تو اللہ تعالیٰ سے کی جانی چاہیئے اور اس جیسی مُحبّت کسی سے نہ ہونی چاہیئے۔

(۴) چوتھا سبب قرب۔ قرابت داری کی وجہ سے بھی مُحبّت کی جاتی ہے۔ بیٹا قریب ہے باپ کا بلکہ جزو ہے، بھائی جزو ہے باپ کا، ماں باپ اولاد وغیرہ کی محبّت قرابت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اب دیکھو کہ خدا تمہارے کس قدر قریب ہے۔ تم خود بھی اپنی ذات سے اس قدر قریب نہیں ہو۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ۔ (قرآن الحکیم)

اگر قرابت داری کے باعث محبت ہے تو اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ قریب ہے۔ مختلف آیتیں اس پر شاہد ہیں کہ انسان کو خود اپنے سے اور کسی انسان سے اتنا قُرب نہیں جتنا اللہ تعالیٰ سے ہے۔ وہ تمہاری روح سے متصل ہے۔ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔

میرے بھائیو! محبّت کے یہ چاروں سبب اللہ تعالیٰ میں بدرجۂ اتم و اکمل موجود ہیں تو چاہیئے کہ اللہ کی محبّت بھی ہر چیز سے زائد ہو۔ خدائے پاک کی دو صفتیں ہیں۔ جلال اور جمال۔ مالکِ نفع و نقصان ہونا صفتِ جلال کے ماتحت ہے اور محبوب ہونا جمال کی وجہ سے ہے۔ جو عبادات محبت کی وجہ سے ہوتی ہیں ان کا طریقہ الگ ہے اور جو مالکیت کی وجہ سے ہوتی ہیں ان کا طریقہ الگ۔ مالکیت میں آداب و سنن کا لحاظ ضروری ہے عقل سے سوچ بچار کر کے ہر کام کو کیا جائے۔ دو عبادتیں نماز اور زکوٰۃ صفتِ مالکیت کے ماتحت مقرر فرمائیں۔ نماز میں من اولہ الیٰ آخر ہر جزو میں آداب کی ضرورت ہے۔ اس میں ذرا سی بھی بے ادبی ہو گی تو عتاب ہو گا۔ اسی طرح محبوبیت کا تقاضا ہے کہ محبوب و محب کے طریقہ پر عمل کیا جائے ؎

موسیا آداب داناں دیگر اند
سوختہ جاں ور داناں دیگر اند

محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بے خودی پیدا ہو جائے۔ اس راہ میں جتنی بے خودی ہو گی اتنا ہی کمال ہو گا۔

ہوگا ؎

عشق چوں خام است باشد بستہ ناموس و ننگ
پختہ مغزانِ جنون را کے حیا زنجیر پاست

محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی عقل، نزاکت، آراستگی اور ہوش سے نکل جائے۔ عشق جب پورا ہو گا کہ اپنے آپ کو پروانے کی طرح محبوب پر نثار کر دے ؎

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد

عشق میں جس قدر بے خودی پائی جائے اسی قدر محمود ہے ع

"عاشقاں را مذہب و ملت جدا ست"

؎ جب پیت بھئی تب لاج کہاں سنسار ہنسے تو کیا ڈر ہے
دُکھ دَرد پڑے تو کیا چنتا اور سکھ نہ رہے تو کیا ڈر ہے

انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے اس کے اندر ایسا عشق ہونا چاہیئے جو نہ بلبل میں ہو نہ پروانے میں، نہ اور کسی کو ایسا عشق نصیب ہو۔

میرے بزرگو! روزہ اور حج یہ دو عبادتیں صفتِ محبوبیت کی بنا پر مقرر کی گئیں اور نماز و زکوٰۃ صفتِ مالکیت کی بنا پر۔ اب دیکھو اگر کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہے پھر دوسروں سے بھی محبت رکھتا ہے تو اسے جھوٹا کہتے ہیں۔ محبوب کے علاوہ سب کو چھوڑ دینا محبت کا تقاضا ہے۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ؕ اللہ تعالیٰ کا جمال گوارا نہیں کرتا کہ دوسرے سے بھی محبت کی جائے۔

پہلی منزل محبت کی ہے کہ محبوب کے سوا سب سے مُنہ پھیر لو۔ روزہ میں کھانا پینا اور بیوی سے ہمبستری کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ عام لوگوں کے لیے ہے، مگر خواص کا روزہ یہ ہے کہ تمام گناہوں کو چھوڑ دیں اور اخص الخواص کا روزہ یہ ہے کہ ذاتِ مقدسہ کے سوا سب کو چھوڑ دیں۔ غیر اللہ کو سامنے بھی نہ لائیں۔ یہ عشق کی پہلی منزل ہے رمضان گزرا شوال سے عشق کی دوسری منزل شروع ہوئی۔ دوسری منزل یہ ہے کہ محبوب کے دار و دیار کیطرف توجہ کی جائے۔ جہاں . . . اس کا کوچہ ہے، جہاں اس نے دوسروں کو نوازا ہے۔ وہاں جایا جائے۔ اس کے در و دیوار

کے پاس پہنچا جائے اور جمالِ محبوب کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے گھر کے اِرد گرد دیوانہ وار پھرا جائے۔ اس کے در و دیوار سے چمٹ کر اس کے سنگِ در کو بوسہ دیا جائے ؎

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی
اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَذَا الْجِدَارَا
وَمَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ
وَلٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَا

مجنوں کہتا ہے کہ میں دیارِ حبیب میں جب پہنچتا ہوں تو اس کے در و دیوار کو بوسہ دیتا ہوں اور مجھ کو ان در و دیوار نے مجنوں نہیں بنایا، بلکہ گھر والے نے من نزل الدیار نے مجنوں بنایا ہے۔

جس قدر دیارِ محبوب سے قریب تر ہوتے جاؤ آتشِ شوق بھڑکتی جائے ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ عشق تیز تر گردد

عاشق کو کہاں زیبا ہے کہ عشق ہو اور لوگوں سے لڑے جھگڑے، اس پر شہوت کا غلبہ ہو اور معشوق کی نافرمانی کا صدور ہو۔ فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ـــــ عاشق ہمیشہ سرنگوں رہتا ہے۔ عشق کا تقاضا ہے کہ کسی امر میں کسی سے لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ اگر سچا عشق اور سچی محبت لے کر نکلے تو ہر چیز سے بالاتر ہو کر محبوب سے لپٹ جاؤ۔

میرے بھائیو! اللہ پاک کے گھر کی طرف جا رہے ہو۔ اس راہ میں بہت سی مشکلات پیش آئیں گی۔ ہمیشہ لڑائی جھگڑے سے بچتے رہو اور یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ خدائے پاک مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہارے ہر حال کو دیکھتا ہے۔ اسی کا نام لیتے ہوئے لَبَّیْکَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَا شَرِیْکَ لَکَ۔ کہتے ہوئے چلو۔ یہ آواز بلند کرتے ہوئے، اللہ پاک کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے تواضع و سکون کے ساتھ چلو۔ جس قدر ممکن ہو صبح و شام دوپہر چڑھتے ہوئے اترتے ہوئے، ہر حال میں لبیک اللّٰھم لبیک الخ پڑھتے رہو۔ لاشریک لک بار بار کہا جاتا ہے۔ سوائے تیرے ہمارا کوئی محبوب نہیں۔

سلے ہوئے کپڑے اتار دو، خوشبو بھی ترک کر دو، دو کپڑے بغیر سلے ہوئے پہن لو، سر کو ننگا رکھو، جوتا

پہنو، مگر پیر کے اوپر کی ہڈی اُبھری ہوئی چھپنے نہ پائے۔ سرمہ نہ لگاؤ، خوشبو نہ لگاؤ، بالوں کو نہ سنوارو، نہانا ضرورتِ شرعیہ سے جائز ہے، خوشبو لگانا، بالوں کو اکھیڑنا، سنوارنا جائز نہیں، شکار مت کرو۔ غرض کہ دیوانوں کی صورت بناؤ۔ یہ چیزیں تو اس کے لیے ہیں جو ہوش و حواس میں ہو۔ عشاق کو اتنا ہوش کہاں ؎

؎ نوبہار است جنوں چاکِ گریباں مددے
آتش افتاد بجاں جنبشِ داماں مددے

؎ ہم نے تو اپنا آپ گریبان کیا ہے چاک
اس کو سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا

؎ عشق میں تیرے کوہِ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

جس قدر مکہ معظمہ سے قریب تر ہوتے جاؤ دیوانگی اور جنوں کے آثار بڑھتے جائیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دی ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ مکہ معظمہ اور خانہ کعبہ میں آثارِ صفتِ جمالیہ ظاہر ہیں۔ ہم کورے ان بزرگوں کی اطاعت اور پیروی میں جو یہ آثار دیکھتے ہیں اللہ کے گھر کے گرد سات چکر لگاتے ہیں۔ صفا و مروہ کے درمیان دوڑتے ہیں۔

بہرحال یہ عبادت مظہرِ عشق ہے اور اللہ تعالیٰ محبوب، اس کے اندر اسبابِ محبت باتم الوجوہ پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی حقیقۃً محبوب ہیں۔ یہ حج اسی لیے فرض کیا گیا کہ اسی محبوبِ حقیقی کے پروانے بنو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کر دیا۔ عاشق کو عشق کی راہ میں کوئی نصیحت کرتا ہے تو اس کو غصہ آتا ہے اور وہ ناصح کو پتھر مارتا ہے۔ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جان کی قربانی دینے جا رہے تھے تو راستہ میں تین جگہ ناصحِ نادان شیطان نے سمجھایا، باپ کے ساتھ کہاں جا رہے ہو؟ انھوں پتھر مارے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح ہونے سے بچا لیا اور جنّت کے مینڈھے کو ذبح کرا دیا۔ یہ اب شریعت ہے کہ مینڈھے اور دُنبے کو ذبح کرنا گویا بیٹے کو ذبح کرنا ہے (رونے کی آواز)

اللہ تعالیٰ کا عشق لے کر جا رہے ہو تو جس قدر ممکن ہو عجز اور انکسار اختیار کرو۔ جملہ عاشقوں کے سردار آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم پر جس قدر ممکن ہو درود شریف پڑھتے ہوئے تلاوت کر کے ہدیہ کیجئے۔ اس راہِ عشق کے سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لیے میرے نزدیک اور علماء کے ایک گروہ کے نزدیک پہلے مدینہ منوّرہ جانا افضل ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝

ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام اُمت کے لیے بلکہ تمام عالم کے لیے رحمت ہیں۔ آپ کے پاس حاضری دے کر عرض کرو، یارسول اللہ ہم حاضر ہوئے ہیں، ہمارے لیے حج کی قبولیت کی دعا فرمایئے، شفاعت فرمایئے، پھر جناب باری سبحانہ کے گھر کی طرف لوٹا جائے تاکہ آپ کے وسیلہ سے اللہ پاک حج کی اس عاشقانہ عبادت کو قبول فرمائے۔

میرے بھائیو! حج کے ایام میں سب سے زیادہ مقدس وقت وقوف عرفہ کا دن اور مزدلفہ کی رات ہے ایسا وقت نہیں ملے گا۔

میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ بے وقوفی کی وجہ سے اس مقدس وقت کو بات چیت، کھانے پینے میں صرف کر دیتے ہیں۔ (رونے کی آواز)

دیکھو بے وقوفی مت کرو، اس وقت کو بے کار مشغلوں میں ضائع مت کرو، اللہ اللہ کرو، تسبیح پڑھو، تلاوت کرو، درود پڑھو، دعا کرو، جبل رحمت کے پاس جانا ضروری نہیں، میدانِ عرفہ میں جہاں توبہ و استغفار کرو۔ بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت اور سیرت سے بیزار ہیں۔ ڈاڑھی منڈواتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے بخاری شریف کی حدیث ہے کہ "ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹاؤ"۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک مٹھی پکڑ کر کٹاتے تھے۔ ایک مٹھی سے کم کو کترواتے صورت و سیرت محمدیہ سے نفرت کرنا ہے۔

دیکھو سکھ ایک بال پر قینچی نہیں لگاتے۔ شرم سے مرجانا چاہیئے کہ مسلمان کو ایسا بڑا رسول ملا کہ کسی قوم کو نہیں ملا اور پھر بھی خود مسلمان ایسے پیارے رسول کی صورت اور سیرت سے بیزاری کا اظہار کرے۔

میرے بھائیو! اس سے بچو۔ آقائے نامدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت اور سیرت کے عاشق بنو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو محبوب ہیں اللہ کے، اگر ان کی اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارا عاشق بن جائے گا تم محبوب بن جاؤ گے يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ اللہ تعالیٰ تمہارا عاشق بن جائے گا۔ تمہارا بیٹا تم کو بہت محبوب ہے، اگر کوئی لڑکا تمہارے بیٹے کی صورت میں تمہارے سامنے آجائے تو بے اختیار تم کو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔

بقیہ بر صہ ۵۹

باسمہٖ سبحانہٗ

داعیٔ اہلِ سُنّت مولانا محمّد کشمیر رحمہ اللہ تعالیٰ

م ۱۴۱۶ھ
۱۹۹۶ء

داعیٔ اہلِ سُنّت ، محمّد کشمیر — عالمِ با عمل ، مردِ روشن‌ضمیر

جانشینِ امیرِ کبیرِ رح شہیر — پیروِ راہِ آں ہادیٔ کاشمیر

فاضلِ دیوبند و ولیِ خدا — مُصلحِ تبّت خُرد ، شیخِ کبیر

آں خجستہ خصال و ستودہ صفات — حاملِ دولتِ فقر و خیرِ کثیر

فیضِ علمی ز انور شہِ رح بے مثال — ہم ز سیّد حسین احمدِ رح بے نظیر

شیخ الیاس رح و از شیخ عبدالشکور رح — باطن و ظاہرِ او شدہ مُستنیر

بالیقیں بود او یادگارِ سلف — اہلِ اسلام را ہمصفیر و سفیر

صاحبِ خُلق ، خلیقِ کریم و حلیم — گفتگواش ملائم ، سخن دلپذیر

ساکنانِ سکردو و خپلو ہمہ — حُسنِ اخلاقِ او را مطیع و اسیر

خادمِ اہلِ بیت رض و صحابہ رض ہمہ — عاشقِ مصطفیٰ بود غایت کثیر

ظلمتِ رفض از نورِ او پاش پاش — ذاتِ او بلتیاں را سراجِ منیر

غازی و زاہد و عبد شب زندہ دار — صائمِ لذّت اندوزِ نانِ شعیر

بادِ مغفورِ ربِّ غفور اے نفیس

بر جاہِ رسولِ بشیر و نذیر

تاریخِ وفات : ۲۹ شعبان المعظم ۱۴۱۶ھ —— صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ——

اثرِ خامہ نفیس الحسینی
۲۲ رمضان المبارک
۱۴۱۶ھ

۱ شاہِ ہمدان امیرِ کبیر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۸۶ھ) ہادیٔ کشمیر

۲ دارالعلوم دیوبند (ضلع سہارنپور ، ہند)

۳ ۴ خاتم المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ اور شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرّہٗ سے حدیث شریف پڑھی ۔ زیادہ تر شاہ صاحب رح سے پڑھا ۔

۵ رئیس التبلیغ بانیٔ تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور طریقۂ تبلیغ سیکھا ۔

۶ امامِ اہلِ سُنّت حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تردیدِ شیعیت کی تعلیم حاصل کی ۔

(قسط : ۲ آخری)

مجاہدِ عظیم شہیدِ اسلام

حضرۃ مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

اس کتاب کا متن ردّ الاشراک ہے۔ جس میں آیاتِ قرآن اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔ اس کے آخری حصّے میں عربی زبان ہی میں کچھ فوائد بھی ہیں۔ مجھے میرٹھ کے ایک قدیم مدرسۂ اسلامیہ کے کتب خانے میں اس کا ایک قلمی نسخہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کے سرِورق پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں : " ردّ الاشراک فی علم الحدیث تالیف مولوی اسمٰعیل برادر زادہ حضرت شاہ عبدالعزیز مرحوم دہلوی المحدّث از کتب خانہ حکیم غلام محی الدّین طبیب ساکن میرٹھ "

اس پر حکیم صاحب مذکور کی مہر بھی ہے۔ جس میں غالباً ۱۲۴۳ھ کندہ ہے۔ قیاسِ غالب یہ ہے کہ مولانا شہیدؒ کے زمانۂ حیاتِ ظاہری ہی میں یہ نسخہ نقل ہوا ہے۔ اس کتاب میں دو باب ہیں۔ ایک باب توحید، دوسرا باب سنّت۔ پوری کتاب کی ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذریعے کلمہ طیبہ کے ہر دو جزو کی تشریح و تفصیل کرنا مقصود ہے۔ کتاب کے آخر میں یہ اشعار درج ہیں جو حضرت شاہ صاحبؒ کے فکر کا نتیجہ ہیں۔

گوید ایں بندہ ضعیف و رذیل — نامِ او ہست عاجز اسمٰعیل
ایں حدیث چند جمع شدہ — کہ ازاں اصلِ شرک قمع شدہ
طرفہ تر آنکہ ایں حدیث نبی — شد مؤید بقولِ ربِّ قوی
آنچہ تقدیم اولاً کردم — ردّ اشراک، مجملاً کردم

یہ کتاب متوسط سائز کے آٹھ جزو پر مشتمل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بعد میں ضرورت محسوس کر کے اس کتاب کے پہلے باب میں ترجمہ و فوائد اردو شامل کر کے اس کا نام تقویت الایمان رکھا۔ دوسرے

باب اعتقاد بالسنۃ کے مندرجات پر عربی زبان میں فوائد ہیں۔ اردو زبان میں اس کو منتقل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد معرکۂ جہاد پیش آگیا۔ محمد سلطان نامی ایک صاحب نے اس کا ترجمہ کر کے تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان نام رکھا۔ چنانچہ وہ تذکیر الاخوان کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"بعد اس کے معلوم کیا چاہیئے کہ ایک فاضل جلیل متشرع دیندار نے (شاہ صاحبؒ نے) شرک اور بدعت کی برائی کے بیان میں ایک رسالہ تقویۃ الایمان لکھا اور اس میں صرف آیتیں اور حدیثیں جمع کیں اور اس کے دو باب ٹھہرائے۔ ایک باب میں توحید کی خوبیاں اور شرک کی برائیاں ہندی (اردو) زبان میں بیان کیں اور دوسرے باب میں اتباعِ سنّت کی خوبیاں اور بدعت کی برائیاں اور تفصیل بعض بدعات کی آیت اور حدیث سے ذکر کی اور ارادہ ہندی ترجمے کا کیا، مگر فرصت نہ پائی اور راہِ خدا میں جان دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب سن بارہ سو پچاس (۱۲۵۰) میں اللہ تعالیٰ نے اس خاکسار، گناہگار محمد سلطان کے دل میں ارادہ اس کے ترجمے کا ڈالا۔ سو دوسرے باب کا ترجمہ ہندی بولی میں شروع کیا۔ اور تذکیر الاخوان بقیہ تقویت الایمان اس کا نام رکھا۔"

تقویۃ الایمان نام کی کتاب یقیناً حضرت شاہ صاحبؒ کی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ناسخین و کاتبین کے قلم سے اس میں کوئی جزوی ردّوبدل ہوگیا ہو۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔ بزرگوں کی کتابوں میں جو کتاب جتنی زیادہ رائج ہوئی ہے اور اس کی جتنی زیادہ نقلیں کی گئی ہیں اس کی بعض عبارتوں میں اتنا ہی جزوی تغیّر و تبدّل ہو جانا کچھ بعید نہیں، بلکہ موجود ہے، لیکن صرف اس معمولی تغیّر کو مصنوعیّت کی دلیل ٹھہرانا سراسر دُور از تحقیق بات ہے۔ غور کیجیے موافقین و مخالفین نے اس کتاب کی تائید و تردید کی۔ اس پر تحریری و تقریری مناظرے ہوئے۔ مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کو اس کتاب کے بعض مضامین پر اعتراض تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا جواب دیا ہے۔ بعد کو بھی شہادتِ شہید سے لے کر اس وقت اہلِ بدعت کی طرف سے اس کتاب پر تصنیف شہید کی حیثیت سے لے دے ہو رہی ہے اور اہلِ حق برابر جواب دے رہے ہیں۔ جو کتاب اس توازن کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب ہو اس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ مصنوعی ہے، ان کی نہیں ہے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک تصنیف "یک روزی" ہے۔ یہ مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم کے اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس کا قلمی نسخہ (محررہ ۱۲۸۰ھ) جو کتب خانہ فیض العلوم پہلت ضلع مظفر نگر میں ہے

میری نظر سے گزرا جس کے آغاز میں یہ عبارت مرقوم ہے۔

"رسالہ ہذا از تصنیفاتِ عالمِ جلیل مقبولِ ربِ جلیل مولانا ذوالفضل والاحسان مولانا مولوی محمد اسمٰعیل شہید مرحوم و مغفور است کہ در دفعِ اعتراضاتِ مولوی فضل حق صاحب در یک روز نویسانیدہ دادہ بودند"

اس رسالے کو شروع کرتے ہوئے خود حضرت شاہ صاحبؒ نے تقویۃ الایمان کا ذکر یوں فرمایا ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ از عبارتِ مرقومہ چناں مستفاد می شود کہ مقصود معترض ایراد اعتراض است بر عبارت رسالہ تقویۃ الایمان بسہ وجہ الخ"

اسی طرح دو ایک جگہ اور بھی تقویۃ الایمان کا نام لیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ۱۲۴۱ھ میں یہ رسالہ لکھا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل اس امر کی ہو سکتی ہے کہ تقویت الایمان حضرت شہید دہلویؒ کی ہے۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک دلیل کافی ہے، پھر بھی مزید اطمینان کے لیے دو تین قلمی اور مطبوعہ (قدیم نسخوں کو پیش کرتا ہوں۔

۱: کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ مخطوطات میں ۱۲۴۶ھ کی لکھی ہوئی یہی تقویت الایمان مصنفہ شہیدؒ کی حیثیت سے موجود ہے [۱]

۲: فہرست کتب قلمی محررہ ۱۲۴۳ھ میں جو کہ مولانا محمد صابر عثمانی مرحوم کے قلم کی ہے۔ تقویت الایمان مصنفہ مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا اندراج ہے۔ دفتری نور الحق صاحب عثمانی دیوبندی نواسۂ شاہ رفیع الدین عثمانی دیوبندی کے پاس یہ فہرست موجود ہے۔

۳: ۱۲۶۵ھ کی مکتوبہ تقویت الایمان میرے پیشِ نظر ہے جس کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہے:

"قد تمت ہذہ الرسالہ المسمیٰ بہ تقویت الایمان من تصنیف مولانا اسمٰعیل صاحب دہلویؒ"

۴: ۱۲ محرم ۱۲۶۷ھ کو جمعۃ موگراں شاہ جہاں آباد (دہلی) مطبع محمدی میں حافظ محمد پیر خاں کے اہتمام سے جو تقویت الایمان چھپی ہے اس کی قلمی نقل بھی میرے پیشِ نظر ہے۔ اس پر مولانا محبوب علی دہلوی کا بھی حاشیہ ہے۔ آخر کتاب کی ایک عبارت پر حاشیہ لکھتے ہوئے محشی نے لکھا ہے۔

"افسوس ایسے موحد، محب رسول کی کہ آخر اس راہ میں شہید ہوئے۔ گور پرست لامذہبوں نے کچھ قدر نہ سمجھی، وہابی کہا، بلکہ بزرگوں کا منکر ٹھہرایا۔ الخ" [۲]

---

[۱] حضرت شہیدؒ کی شہادت ۱۲۴۶ھ میں ہوئی ہے۔ گویا تقویت الایمان کا یہ نسخہ اس سال کا لکھا ہوا ہے ۱۲

[۲] مولانا محمد منظور نعمانی فرماتے ہیں کہ تقویت الایمان حضرت شہیدؒ کی حیات میں ان کی شہادت سے ۴ سال پہلے ۱۲۴۲ھ میں ←

اب آپ فرمایئے کہ ردّ الاشراک کو دیکھ کر تقویت الایمان کے بارے میں خواہ مخواہ شبہ پیدا کر دینا کہاں کی تحقیق ہے ؟ اسی کے ساتھ ساتھ میں تنویر العینین کے متعلق بھی کہتا ہوں کہ یہ بھی یقیناً حضرت شاہ صاحب کی تصنیف ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے آخر میں اس کے بعض مضامین سے رجوع کر لیا ہو۔ مجھے اپنے ایک بزرگ استاد سے یہ روایت پہنچی ہے کہ نواب قطب الدین دہلوی مؤلف مظاہرِ حق شاگرد حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ نے حضرت شیخ الہندؒ سے فرمایا کہ تنویر العینین حضرت شہیدؒ کی تصنیف نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نواب قطب الدین دہلویؒ کو حضرت شہیدؒ کے آخری فعل سے یہ شبہ ہوا ہو۔ اس سلسلے میں مولانا کرامت علی جونپوریؒ کی بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے جس میں انہوں نے ذخیرہ کرامت ص۲۲۴ ج ۲ میں مولوی مخلص الرحمٰن کے سوال کے جواب میں فرمایا ہے :

"تنویر العینین جو کتاب ہے سو اس میں مولانا محمد اسمٰعیلؒ کے لکھے ہوئے چند ورق رفع یدین کی ترجیح میں ہیں اور بعد اس کے مولانا مرحوم نے اپنے مرشد حضرت سیّد احمد قدس سرہٗ کے سمجھانے سے اپنے قول سے رجوع کیا یعنی رفع یدین چھوڑ دیا۔"

تقویت الایمان پر کیے گئے اعتراضات زیادہ تر غلط فہمی و کج فہمی یا فرنگیوں کی سازش پر مبنی ہیں

تقویت الایمان کے متعلق تو یہ ثابت ہوچکا کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحبؒ کے افادات میں سے ہے۔ اس مخزنِ علم توحید کو شاہ صاحبؒ کی جانب منسوب کرنے میں نہ مجھے کوئی جھجک ہے اور نہ کوئی مصلحت مانع ہے جس وقت اور جس ماحول میں یہ کتاب لکھی گئی اس کو پیشِ نظر رکھا جائے اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ کس مضمون میں یہ کتاب ہے ؟ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ جیسی حساس طبیعت اور فاروقی جذبات والی شخصیت کے قلم سے یہ کتاب اس وقت نکلی ہے جب شرک و بدعات کا زور تھا اور اردو نثر نے بھی کچھ ترقی نہیں کی تھی ، بلکہ مذہبی اُردو

← کلکتہ میں طبع ہوگئی تھی۔ اس ایڈیشن کے نسخے اگرچہ قریباً نایاب ہیں، لیکن بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں بھی محفوظ تھا۔ اس عاجز کو بھی اب سے ایک سال پہلے تک اس نسخہ کا علم نہیں تھا۔ میرے ایک عزیز دوست مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے اس کو تلاش کر کے نکالا اور اس کا فوٹو اسٹیٹ لے لیا۔ اس عاجز نے اس کو دیکھا ہے۔ اس نسخہ کے دریافت کے بعد ان لوگوں کی غلطی واضح ہوجاتی ہے جنہوں نے تقویت الایمان کے حضرت شہیدؒ کی تصنیف ہونے کے بارے میں شک شبہ کا اظہار کیا ہے یا اس کی بعض عبارتوں کے بارے میں الحاق کی بات کہی ہے۔ (محمد منظور نعمانی املاءً) ماہنامہ الفرقان مولانا نسیم احمد فریدی نمبر ص۱۸۳

" بمبئی میں عموماً مولانا اسمٰعیل رح کے نام سے لوگ جلتے ہیں، لیکن جلنے کی وجہ صرف سنی سنائی باتیں ہیں جن کی کچھ بنیاد نہیں اور وہ محض بے اصل ہیں۔ ایک دن جمعہ کو میں بمبئی کی جامع مسجد میں گیا تو نماز پڑھنے کے بعد مجھے ایک دوست نے ٹھہرالیا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ کئی شخص اور بھی میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے ان کی گفتگو سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لکھے پڑھے ہیں۔ وہ باہم مولوی اسمٰعیل صاحب کا ذکر تحقیر آمیز الفاظ میں کر رہے تھے اور ایسی ایسی بے بنیاد باتیں قائم کر رہے تھے جو میرے کانوں میں جہاں تک مجھے یاد ہے کبھی نہ پڑی تھیں۔ ایک شخص تو یہ کہہ رہا تھا کہ تقویت الایمان سوائے کفر کے کچھ نہیں ہے۔ نبی ص اور آپ کے صحابہ رض کو برملا گالیاں (نعوذ باللہ) دی گئی ہیں۔ دوسرا شخص بولا صوفیوں کو تو ایسا سخت لکھا ہے کہ ہندو عیسائی بھی کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ یہ ناواجب باتیں سن کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ ہر چند میں چاہتا تھا کہ ان کے خیالات میں خلل اندازی نہ کروں، لیکن جب قرآن کا یہ ارشاد ذہن میں آیا کہ حق کی بات چھپانی نہیں چاہیئے، میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھا اور میں نے نہایت ادب سے ان کی خدمت میں یہ عرض کیا۔ "آپ نے تقویت الایمان دیکھی ہے؟" انہوں نے نہایت سادگی سے بے پروایانہ لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں۔ ہم نے نہیں دیکھی اور نہ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے نہایت عاجزی سے ان کی خدمت میں عرض کیا۔ "بڑے ظلم کی بات ہے۔ آپ نے ایک چیز ملاحظہ نہیں کی اور اس کی بابت اس مضبوطی سے رائے قائم کی جاتی ہے۔" میری اس بات سے وہ ناراض ہوئے اور انہوں نے میری طرف حقارت کی نظر سے دیکھا۔ پھر میں نے یہی التماس کیا کہ میرے خیال میں زیادہ بہتر یہی ہوگا کہ آپ اسے ملاحظہ فرما کر اس پر رائے قائم کریں۔" بڑی ردّ و کد کے بعد انھوں نے میری بات مان لی۔ میں نے انہیں تقویت الایمان بھجوادی۔ آٹھویں دن جب وہ مجھ سے ملے تو ان کے خیالات ہی بدلے ہوئے تھے۔" (ص ۱۹۶)

بہر حال اس خالص مضامین توحید پر مشتمل کتاب کی افادیت کا انکار کرنا (جس نے بے شمار انسانوں کی اصلاح کر دی) سخت ناانصافی اور ہٹ دھرمی ہے۔

تقویت الایمان پر سب سے پہلا علمی اعتراض

تحقیق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقویت الایمان پر سب سے پہلا اعتراض مولانا فضل حق خیر آبادی

نے کیا تھا۔ وہ ایک علمی اعتراض تھا۔ مولانا خیر آبادی خود ایک جیّد منطقی عالم اور خاندان ولی اللّٰہی کے فیض یافتہ تھے۔ اُنہوں نے مولانا شہیدؒ کی ایک عبارت سے امکانِ نظیر کا مفہوم پیدا کیا جس کی تعبیر بالفاظ صحیح اثباتِ قدرت سے ہوسکتی تھی۔ قدرت کو منظور تھا کہ سرزمینِ دہلی پر علم کلام کا یہ زبردست مسئلہ حل ہو جائے۔ مولانا خیر آبادی نے ایک رسالہ اس سلسلے میں لکھا اور ایک معقولی عالم کی حیثیت سے معقولی انداز میں تقویت الایمان کے بعض مضامین پر اعتراضات کیے۔ اس رسالے میں نہ تو "ذوقِ کفر سازی" کی تسکین تھی نہ سب وشتم۔ صرف اپنے تأثرات کو پیش کیا گیا تھا۔ ان کے اعتراضات کا خلاصہ خود حضرت شہید کے لفظوں میں یہ ہے:

۱: دعوائے تعلقِ قدرتِ الٰہیہ بمثل محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم فی نفسہا باطل ست

۲: دعوائے مذکور اساتِ ادب است بجناب سیّد المرسلینؐ۔

۳: ذکرِ آں لغو است

حضرت شہیدؒ نے یک روزی میں ان اعتراضات کے جو جواب دیئے وہ تمام کے تمام پڑھنے کے قابل ہیں حضرت شہیدؒ نے عقل و نقل کی مدد سے ایسے مدلّل جوابات دیئے کہ منصف مزاجوں کے نزدیک بحث کو گویا ختم ہی کر دیا۔ حضرت شہیدؒ کے جوابات کا خلاصہ ترتیب اعتراض کے لحاظ سے یہ ہے:

۱: وجودِ مثلِ پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم، تحت قدرت الٰہیہ داخل ہے۔ تحت تکوین نہیں۔ اگر تحت تکوین داخل ہو تب وقوع لازم آئے گا۔ قدرت علیحدہ صفت ہے اور تکوین علیحدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قدیر۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا ـــــ برہان عقلی یہ ہے کہ وجود مثل ممتنع بالغیر ہے اور ہر ممتنع بالغیر ممکن بالذات ہے اور ہر ممکن بالذات، داخلِ تحتِ قدرتِ الٰہیہ ہے۔ پس وجودِ مثلِ مذکور داخلِ تحتِ قدرتِ الٰہیہ ہے۔

۲: اساءت و بے ادبی کے متعلق جو کہا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وزیر کو بادشاہ کا نوکر کہنا، باپ کو دادا کا لڑکا کہنا اور استاد کو اس کے استاد کا شاگرد کہنا ہرگز اساتِ ادب نہیں ہے۔ "وجود مثل" کے "تحتِ قدرتِ الٰہیہ" داخل بتانے سے اساءت ادب اور بے ادبی ہرگز نہیں ہوتی اور نہ اس سے "اضلالِ عوام" لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں آنجناب صلّی اللہ علیہ وسلم کی عبودیت کا اظہار ہے جو کہ اہم دینی مقاصد میں سے ہے۔ جس طرح کہ بعد وفات سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نفسِ کمالِ نبوّت اور اس کے لوازم۔ نزول وحی اور عصمت کا سلب و انقطاع اولیاءِ کرام سے کرنا یہ اولیاء کی شان کی تنقیص نہیں ہے اسی طرح الوہیت کا سلب و

نثر کی بالکل ابتدا تھی اور یہ خاندانِ ولی اللّٰہی کا صدقہ ہے کہ اردو زبان کو قرآن کا ترجمہ ملا اور اسی خاندان کے ایک فردِ جلیل نے توحید کے پھولوں سے دامنِ مراد کو بھر دیا۔ آج کی ترقی یافتہ اردو کو معیار بنا کر اس کتاب کو جانچنا ایک زبردست علمی و تحقیقی غلطی ہوگی ویسے تقویت الایمان اپنی عبارت کی شستگی اور روانی کے لحاظ سے آج بھی اہلِ نظر کی نگاہوں میں بہترین مانی گئی ہے۔

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے :

"ان کی (حضرت شہیدؒ کی) اہم ترین کتاب تقویت الایمان ہے جو انہوں نے اُردو زبان میں اس وقت لکھی جب اس زبان کو ابھی گھٹنوں چلنا نہ آتا تھا۔" الخ (موجِ کوثر صـ۳۵)

ایک جگہ اسی موجِ کوثر میں ہے :

"یہ کتاب نہ صرف مذہبی، بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہم ہے۔ اس کا طرزِ تحریر ایسا با اثر اور پُر زور ہے کہ بقول صاحب سیر المصنفین معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریائے ذخار امڈا چلا آتا ہے۔"

تعجب تو یہ ہے کہ اس کتاب کو غور سے دیکھے بغیر بہت سے لوگوں نے محض سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرتے ہوئے ان دشمنانِ شہید کی ہم آہنگی کی جنہوں نے غالباً "اشارۂ چشمِ فرنگ" پہ یہ تمام ہنگامۂ "رستخیز" برپا کیا اور دیدہ و دانستہ خدا کا خوف نہ کرکے کفر کے فتوے لگائے۔ بہت سے عوام بیچارے اچھے اچھے لباسوں اور چہروں سے مرعوب ہو کر وہی کہنے لگے جو ان مقدس کفر سازوں نے کہا، لیکن حقیقت بے نقاب ہوتی جا رہی ہے اب جبکہ "دجل و فریب" کی کارگزاریاں واضح ہو رہی ہیں اور جعل سازوں کی تمام جعل سازیاں کھل کر سامنے آ رہی ہیں بات بھی نمایاں ہو جائیگی کہ فرنگی کی حکومت مضبوط کرنے کے لیے اس کے ایماء سے اور اس کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کے لیے حضرت شہیدؒ اور ان کی جماعت کی بے پناہ محبوب و مؤثر شخصیتوں کے اثرات زائل کرنے میں کن کن "تقدس مآبوں" نے کام کیا ہے اس مقالے میں گنجائش نہیں، ورنہ ارادہ تھا کہ اس بحث کو بھی پایۂ تکمیل تک پہونچاتا۔ مرزا حیرت نے حیاتِ طیبہ میں تقویت الایمان کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے اس کو یہاں نقل کرتا ہوں جس سے یہ بات واضح ہوگی کہ حقیقت سامنے نہ آنے کی وجہ سے بھی غلط فہمیاں پھیلتی اور قائم رہتی ہیں۔ جوں ہی صحیح بات سامنے آجاتی ہے باطل راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ لکھتے ہیں :

لہ دیکھئے سیرت سید احمد شہید طباعت دوم صـ۲۴۳

انقطاع اور الوہیت کے لوازم، وجوب و قِدم، احاطہ علم، عموم قدرت اور امتناع شریک کا سلب و انقطاع آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کرنا ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص نہیں ہے۔

۳ : میرا مقصود شمولِ قدرتِ الٰہیہ ہے معدومات پر اور چونکہ بحیثیتِ ظاہر ذاتِ والاصفات جناب سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، باعتبار ایجاد، اکملِ کائنات اشرف المخلوقات اور اصعبِ مجعولات ہے۔ اس لیے اکمل مفروضات، نظیر مفروض آنجناب ہی ہے پس میں نے تقویت الایمان میں "شمولِ قدرتِ الٰہیہ بر جمیع معدومات ممکنہ کو اسلوبِ بلیغ سے بیان کیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ فلاں معمار بابِ عمارت میں اتنی مہارت رکھتا ہے کہ جامع مسجد دہلی جیسی تعمیر کر سکتا ہے۔ اس سے جہاں معمار کی مہارت تامہ معلوم ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ جامع شاہ جہاں آباد کی حسنِ تعمیر میں دوسری (ہندوستانی) مسجدوں پر شرافت اور خوبی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

پورے رسالے میں جو لاجواب جوابی مضامین ہیں ان کی تشریح و تفصیل کے لیے ایک مستقل مقالے کی ضرورت ہے۔ اس وقت بقدرِ ضرورت پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مولانا شہیدؒ کے زمانے ہی میں اہلِ علم کے رُوبرو یہ مسئلہ تشفی بخش جوابات کے ساتھ واضح ہو گیا تھا اور غالباً اس سے پہلے یہ علمی مسئلہ اتنی وضاحت کے ساتھ صاف نہ ہوا ہوگا، مگر تعجّب ہے کہ اہلِ باطل بار بار مکروہ طریقے سے اس مسئلے کو دوہرا رہے ہیں اور اپنی جہالت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔

تقویت الایمان کے خلاف تکفیر بازوں کا طوفان

بعد شہادت حضرت شہیدؒ میدان خالی پاکر اس مفید ایمان کتاب کے خلاف وہ طوفان برپا کیا کہ الامانُ الحفیظ اس میں ایک فتویٰ اس کتاب کی تقبیح اور معتقدوں کی تکفیر میں بعض عبارات لے کر مرتب کیا گیا۔ جب یہ فتویٰ کلکتہ پہنچا تو عوام مومنین تقویت الایمان کے فیض سے شرک و بدعت چھوڑ چکے تھے۔ اس فتویٰ کے وحشت انگیز مضامین دیکھ کر تذبذب میں مبتلا ہوئے۔ آخر کار بغرض تحقیق اس بارے میں انہوں نے استفتار کیا۔ علماء کی ایک بڑی جماعت نے تقویت الایمان کی موافقت میں دو فتوے دیے۔ ایک مجمل اور دوسرا مفصل اور ان پر اپنی مہریں اور دستخط ثبت کیے۔ ان دونوں فتوؤں کے اچھے اثرات پڑے اور وہ شبہات و وساوس جو عوام میں پیدا کیے گئے دُور ہو گئے۔ رجب علی حسینی لکھنوی نے دونوں فتوؤں کو شائع کرا دیا ہے۔ ان کی ایک قلمی نقل میرے سامنے ہے۔ ان علماءِ کلکتہ میں سے جنہوں نے موافقت میں فتوے دیئے چند کے اسماء یہاں بھی درج کرتا ہوں۔

مولانا غلام سُبحان، مولانا سیّد محمد مراد، مولانا وارث علی، مولانا عبدالباری قاضی شہر کلکتہ، مولانا اکبر شاہ کابلی، مولانا محمد سلیمان الہروی، مولانا رمضان علی (مدرسین مدرسہ کلکتہ) مولانا منصور احمد، مولانا خادم حسین مدرسین مدرسہ کلکتہ مولانا صاحب علی خاں، مولانا ریاض الدّین وغیرہم من العلما والصلحا۔

ان فتوؤں پر مولانا کرامت علی جونپوری کے بھی دستخط موجود ہیں۔ بعد کو بدایوں اور الہ آباد کے بعض علمار نے تقویت الایمان کے رَد میں رسالے لکھے اور ایک مشہورِ زمانہ "کفر ساز بزرگ" نے تو "وہابیہ، نجدیہ، اسمٰعیلیہ دیوبندیہ و محمدیہ کے رَد میں ان کے بعض ہمنواؤں کے بقول دو سو کتابیں لکھیں۔ (تاریخ وہابیہ صہ ۳۹)

مگر کیا ہوا؟ یہ سارے تکفیری فتوے اور یہ تمام تحریریں حق کے سامنے بیکار گئیں۔ بھلا چاند پر خاک ڈالنے سے فائدہ؟ ان تکفیر بازوں نے حضرت شہیدؒ کے حق میں آج تک جو ہرزہ سرائی نفسانیت یا کج فہمی سے کی ہے وہ موجود ہے اور حضرت شہیدؒ کے کارنامے اور ان کی خدمتِ دینیہ بھی۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھے گا مستقبل کا مؤرخ شہیدؒ کے روشن کارناموں کو سراہتے ہوئے ان کافرساز دشمنانِ حق کی یاوہ گوئیوں پر اظہارِ نفرت کریگا۔

مَیں چاہتا ہوں کہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی ایک الہامی کیف آور اور حق آگیں تحریر پہ اس بحث کو ختم کردوں۔ فرماتے ہیں:

"۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ سے لے کر اس دن تک جس کو سو برس سے زائد ہوئے شاید کوئی دن طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام (حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی) کی جس کی اور فضیلتیں برطرف اس کی شہادت مسلم اور شہدا کی مغفرت مسلم ــــ تکفیر و تذلیل میں کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو۔ لعنت و سب و شتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو۔ فقہ و فتاوٰی کی کوئی دلیل ایسی نہیں جو اس کے کفر کے ثبوت میں نہ پیش کی ہو۔ وہ ابوجہل اور ابولہب سے زیادہ دشمنِ اسلام خوارج و مرتدین سے زیادہ مارق من الدّین و خارج از اسلام فرعون و ہامان سے زیادہ مستحقِ نار، کفر و ضلالت کا بانی، بے ادبوں اور گستاخوں کا پیشوا۔ شیخ نجدی کا مقلد و شاگرد بتایا گیا اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کے جسم نازک میں اللہ کے لیے ایک پھانس بھی نہیں چبھی۔ جن کے پیروں میں اللہ کے راستے میں کوئی کانٹا نہیں گڑا۔ جن کو خون چھوڑ کر (کہ اس کا ان کے یہاں کیا ذکر) اسلام کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کی ماؤں بہنوں، بیٹیوں کی عزت و عصمت بچانے کے لیے اس نے اپنا سر کٹایا تو کیا اس کا یہی گناہ تھا؟ اور کیا دنیا میں احسان فراموشی

کی اس سے بڑھ کر کوئی نظیر مل سکتی ہے۔؟ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین وایمان، جان ومال، عزت و آبرو محفوظ نہ تھی اس وقت یہ غیرتِ ایمانی وحمیّتِ اسلامی والے جو ایک "کلمۂ کفر" برداشت نہیں کر سکتے کہاں تھے؟ اور کیا آج بھی شاہ ولی اللہ کے پوتے کے علاوہ کوئی کافر نہیں ——— ؟ ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(سیرتِ سید احمد شہیدؒ بار دوم ص ۳۵۷-۳۵۸)

شہادت

حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے ساتھ تین ہزار میل کا راستہ طے کر کے پشاور کے علاقے میں پہونچے۔ یہاں اللہ کا پیغام سنانے اور اللہ کے کلمہ کو اونچا کرنے کے لیے جتنی کوششیں وہ کر سکتے تھے انہوں نے کیں۔ سخت سے سخت مصیبتیں اٹھائیں، انتہائی مشقتیں برداشت کیں اور صبر آزما محنتیں جھیلیں۔ جتنی جنگیں مجاہدین نے لڑیں ان سب میں سب سے زیادہ حصّہ لیا۔ جو سیاسی خطوط حکمرانوں کے نام روانہ ہوتے تھے وہ زیادہ تر آپ ہی کے لکھوائے ہوئے ہوتے تھے۔ مرزا حیرت کے بیان کی رو سے گیارہ جنگیں ہوئیں۔ ان سب میں حضرت مولانا شہیدؒ دہلوی شریک رہے۔ بالآخر بالاکوٹ کے میدان میں اپنے پیر ومرشد کے ہمراہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کو جمعہ کے دن اپنے خون کا آخری قطرہ اللہ کے راستے میں بہایا۔ وہیں آپ کی قبر ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون وخاک غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

خبرِ شہادت دہلی میں

حضرت شہیدؒ دہلوی کی خبرِ شہادت سے دہلی ہی میں نہیں تمام ہندوستان میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی ہوگی، لیکن یہ سُن کر آپ کو تعجّب ہوگا کہ اس وقت دہلی میں دنیا بیگ جیسا سخت دل حاسد بھی موجود تھا۔ جس نے شہادت کی خبر سُن کر اس خوشی میں جامع مسجد دہلی میں مٹھائی تقسیم کی تھی۔ (حیاتِ طیبہ بحوالہ مجموعہ واقعات ص ۱۰۹)

مگر شریف النفس اور نیک دل مدّ مقابل ایسے ہوتے ہیں جیسے مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم لکھا ہے کہ:

"مولوی فضل حق خیر آبادی سے خاصی کشمکش رہی تھی۔ مولوی صاحب نے شہادت کی خبر اس وقت سُنی

جب طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے۔ یہ سنتے ہی کتاب بند کر دی۔ گھنٹوں بیٹھے روتے رہے۔ اس کے بعد کہا کہ اسمٰعیل کو ہم مولوی نہ جانتے تھے۔ وہ اُمّتِ مُحمّدیہ کا حکیم تھا۔ کوئی شئے نہ تھی جس کی انیت اور لمیّت اس کے ذہن میں نہ ہو۔" (جماعت مجاہدین صـ ۱۲۹ بحوالہ حیات بعد المات)

حضرت مولانا شہیدؒ کی اولاد کے بارے میں سوانح احمدیہ میں لکھا ہے:

اولاد

"محمّد عمر آپ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۶۸ھ میں وہ بھی لاولد رحلت کر گئے۔"

شاہ محمّد عمرؒ مجذوب صفت بزرگ تھے۔ تذکرۃ الرشید اور ارواحِ ثلثہ میں ان کے متعلق کچھ حکایات ملتی ہیں۔

مولانا محمّد حسین فقیر دہلوی کا قصیدہ

آخر میں دہلی کے مشہور واعظ مولانا محمد حسین فقیرؒ کے ایک قصیدے کا انتخاب درج کرتا ہوں۔ یہ قصیدہ فقیر دہلویؒ نے حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ دہلوی کی شان میں لکھا ہے۔ اس میں حضرت مولانا شہیدؒ کی زندگی کے اہم واقعات آگئے ہیں۔ شاعری کے لحاظ سے اس قصیدے کا اگرچہ کوئی مقام نہیں ہے، لیکن مولانا فقیر دہلویؒ جیسے صاحبِ مقام بزرگ کی یہ یادگار ہے اور اسی لحاظ سے اس کو یہاں لے رہا ہوں۔

پوچھیے نام تو ہم نامِ ذبیح اللہ تھے　　بوعمر تھے وہ اگر پوچھیے ان کی کنیت
دیکھنے والے ابھی ان کے بہت ہیں موجود　　کیجئے تصدیق جو اس غرض میں شک ہو حضرت
عالم ایسے تھے کہ کیا علم کا ان کا ہو بیاں　　علماء کو بھی رہی علم سے ان کے حیرت
صرف میں نحو میں وہ رتبہ عالی ان کا　　ابن حاجب کی نہ تھی عہد میں ان کے حاجت
ایک جملہ بھی سنے ان کے بیان سے تو مدام　　محو نحوی رہے صرفی کو ہو مصروفیت
اہلِ معقول بنے ان کے بیاں سے معقول　　اہلِ ہیبت پہ رہی ان کی ہمیشہ ہیبت
ہر اشارہ تھا اشارات شفا تھا ہر لفظ　　بو رسینا کو کلام ان کا سکھا دے حکمت
جو ادب میں انہیں سکّا کی دوراں کہئے　　کب بجا ہے کہ یہ ہے بے ادبی کی نسبت
علم تفسیر کو کیا کہیئے کہ گویا ان کو　　ابن عباسؓ کی تھی رُوح سے حاصل قربت
کیا بیان معنی قرآن کیے سُبحان اللہ　　گویا ان آنکھوں کو دکھلا دیئے نار و جنت

اس قدر علمِ احادیثِ رسولِ حق تھا — نائبِ ختمِ رسل ان کی مناسب ہے صفت
تھے وہ بے واسطہ تلمیذِ بخاریؒ گویا — ایسے شاگرد سے مسلم کو بھی ہوتی راحت
ترمذیؒ کے اگر وہ عہد میں ہوتے تو ضرور — نورِ چشم اپنا سمجھتے وہ انہیں بے منّت
ہوتے مالکؒ کے زمانہ میں اگر مولانا — ملک تدریس کے دیتے وہ انہیں ملکیت
پاتے قسمت سے اگر دورِ سلیمانؒ[1] کی حدیث — سارے شاگردوں سے لے جاتے گوئے سبقت
ابنِ ماجہ کا اگر وقت میسر ہوتا — کرتے وہ ان کے لیے سب سے زیادہ عزّت
گویا محفوظ تھیں سینے میں احادیث صحیح — تھے خبردار خبر سے وہ بہت باخبرت

بوحنیفہؒ کا زمانہ بھی اگر وہ پاتے — مجتہد اُن کو بنا دیتی انہوں کی صحبت
ہوتے شاگردوں میں مانند ابو یُوسُف وہ — کرتے جو خدمتِ نعمانؒ سے حاصل برکت
عالم و عامل قرآن و حدیث ایسے تھے — ان کا دستورِ عمل تھا بہ کتاب سُنّت

واعظ ایسے تھے کہ کیا ان کے بیاں کا ہو بیاں — سننے والوں کی عجب ہوتی تھی رغبت ہیبت
جب حدیث نبویؐ کا وہ بیاں کرتے تھے — ہوتا تھا خلق سے معدوم، حدوثِ بدعت
ذکر دوزخ کا جو آتا تو جلا دیتی تھی — آتشِ خوفِ خدا پنبۂ خوابِ غفلت
اور جنّت کا بھی کچھ ذکر جو آجاتا تھا — سن کے کفار بھی اسلام کی کرتے رغبت
اور جو کرتے تھے کبھی ہولِ قیامت کا بیاں — مجلس وعظ کی ہو جاتی تھی ایسی صورت
ایک کو دوسرے کی کچھ نہ خبر رہتی تھی — اس قدر ہوتی تھی ہر ایک کے دل کو دہشت
سر کو سجدے میں جھکا دیتے ہی بن پڑتی تھی — بے نمازوں کی بدل جاتی تھی ایسی حالت
اکل و شرب اپنا فراموش وہ کر دیتے تھے — روزہ خوروں کو تھی اس وعظ کی ایسی ہیبت
جو نہ دیتے تھے زکوٰۃ ان کا یہ ہوتا تھا حال — صَرف کل مال میں وہ کرتے تھے صرفِ ہمّت

---

[1] سلیمان ابن اشعث سجستانی صاحب سُنن

عیش میں گھر سے بھی تھا جن کو نکلنا مشکل — سفر حج کی پیادہ ہوئی ان کو رغبت
ہو گئے سینکڑوں زانی بھی زنا سے تائب — اور مے خوار بھی توبہ سے ہوئے پاک صفت
زانیہ عورتیں بھی ان کی نصیحت سُن کر — باندھتی تھیں کسو دیندار سے عقدِ حلت
ہے یہ مشہور کہ دہلی میں وہ اک روز کہیں — اک زنِ فاحشہ کے در پہ گئے با عزّت
اس کو کچھ ذکرِ قیامت سنایا تو وہیں — وہ بھی تائب ہوئی اور اسکی جو تھیں ہم صحبت
اور ان سب کے دیئے باندھ اسی لحظہ نکاح — اللہ اللہ یہ تھی ان کے بیان کی ہیبت

اور دہلی ہی کی مسجد میں یہ مشہور ہے بات — حوض تک رہتا تھا بازار لگا بے دہشت
خیر کی جائے کو کر ڈالا تھا اک موقع شر — اس قدر شہر میں تھی اہلِ ہوا کی کثرت
بہ طفیل ان کے وہاں سے یہ بَلا دُور ہوئی — موضعِ خیر میں افزوں ہوئی بس خیریت

مسجدیں سینکڑوں آباد ہوئیں ان کے سبب — مرد و زن لاکھوں نمازی ہوئے صافی طینت
ہر نمازی کو ہوا شوقِ تہجّد ایسا — بسترِ خار بنا، بسترِ خواب راحت

ہر جگہ دینِ محمّد کا رَواج ایسا ہوا — ظلمتِ دہر میں روشن ہوا نُورِ سنّت
دیکھو دشوار تھا کیا کچھ زنِ بیوہ کا نکاح — وہ بھی آسان ہوا ان سے علیہ الرحمت

اور مہاجر بھی وہ ایسے تھے کہ سبحان اللہ — نَاہَی اللہ سے تھی ان کو ہمیشہ ہجرت

غازی ایسے تھے کہ کیا ان کی عزا کا ہو بیاں — آبِ شمشیر کو پیتے تھے وہ مثلِ شربت
مال سے، ملک سے اور جاہ سے کچھ کام نہ تھا — تھا تو یہ کام تھا عالی ہو یہ دین و ملّت
راہِ مولیٰ میں ہی قربان ہوئے واہ نصیب — اور حیات ابدی پائی علیہ الرحمت

مولانا آزاد کی چند سطریں

حضرت شاہ شہیدؒ کے اس مختصر تذکرہ کو مولانا فقیرؒ دہلوی کے قصیدے پر ختم کرنے کا ارادہ کر لیا گیا تھا اس کے بعد اب سے بیس (۲۰) برس پہلے کے الفرقان کے ایک شمارہ میں حضرت شہید دہلویؒ کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کی یادگار کتاب "تذکرہ" کا چند سطر کا اقتباس نظر پڑا، مناسب معلوم ہوا کہ اسی کو اس کا خاتمہ بنایا جائے۔

مولانا آزاد مقام دعوت و عزیمت دعوت پر کلام کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی کے تجدیدی کارناموں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"اور پھر چند قدم اور آگے بڑھو، مقام عزیمت دعوت کی کیسی کامل آشکارا مثال سامنے آتی ہے حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع اور کامل ہے ؟ بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا تجدید تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مردِ میدان کا منتظر تھا اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ و مجدد مولانا محمد اسمٰعیل شہید رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا ؎

میخواست رست خیز ز عالم بر آورد آں باغباں کہ تربیت ایں نہال کرد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انہیں کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔ حضرت پیر انصاری کا قول یاد رہے۔ "من مرید خرقانی ام لیکن اگر خرقانی دریں وقت می بود باوجود پیریش مریدی می کرد"۔ شاہ صاحب نے مزاج وقت کے عام تحمل و استعداد سے مجبور ہو کر بحکم ؎

بہ رمز نکتہ ادا میکنم کہ خلوتیاں سر سبو بکشادند و در فرو بستند

دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے تھے اب اس سلطانِ وقت و اسکندر عزم کی بدولت شاہ جہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا۔ اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور فسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ

(بقیہ بر صہ ۵۹)

قسط : ۵

مضامینِ علمیہ

تحفۂ اصلاحی

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ

○

ایمن احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر "تدبر القرآن" کے علاوہ اصولِ تفسیر میں "مبادی تدبر تفسیر" اور اصولِ حدیث میں "مبادی تدبرِ حدیث" بھی لکھی ہیں۔ اصلاحی صاحب کے مبادی اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اپنے سلسلہ مبادی میں انہوں نے جو گل افشانیاں کی ہیں وہ مدلل البطال اور احقاق حق کے ساتھ ہدیۂ قارئین ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اصلاحِ احوال کا ذریعہ بنائے آمین

آگے ایمن احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں :

"پہلے درجے میں صاحب الکفایۃ ان روایات کو رکھتے ہیں جو مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہوں"

(ا) عقل جن کی صحت کی گواہی دیتی ہو (مما تدل العقول علی موجبہ) اور جن کو عام عقل (COMMON SENSE) قبول کرتی ہو۔

(ب) جن کا تقاضا نصوص قرآن یا نصوص سنت کرتے ہوں۔

(ج) جن کو امت نے قبول کیا ہو۔ (مبادی تدبر حدیث ص۲۲)

ہم پہلے الکفایہ سے اصل عبارت نقل کرتے ہیں اور پھر بتائیں گے کہ اصلاحی صاحب نے یہاں کیا تلبیس کی ہے اور اس کے کیا اثرات پڑ سکتے ہیں۔

صاحب الکفایہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں :

"اما الضرب وھو مایعلم صحتہ فالطریق رہی پہلی قسم تو یہ وہ خبر ہے جس کی صحت کا علم ہو۔ اگر یہ (خبر)

الی المعرفة ان لم یتواتر حتی یقع العلم الضروری به ان یکون مما تدل العقول علی موجبه کالاخبار عن حدث الاجسام واثبات الصانع وصحة الاعلام التی اظهرها الله عزوجل علی ایدی الرسل ونظائر ذلك مما ادلة العقول تقتضی صحته۔

وقد یستدل ایضاً علی صحته بان یکون خبرا عن أمر اقتضاه نص القرآن أو السنة المتواترة أو اجتمعت الامة علی تصدیقه أو تلقته الکافة بالقبول و عملت بموجبه لاجله (الکفایة فی العلم الروایة ص۱۷)

متواتر نہ ہو کہ جس سے علم ضروری حاصل ہوتا ہے تو پھر اس کی (یعنی اس خبر کی صحت کی) معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ یہ خبر ایسی ہو کہ جس کے موجب اور حکم پر عقل دلالت کرتی ہو۔ مثلاً اجسام کا حادث ہونا اور صانع کا اثبات اور ان معجزات کی صحت جن کو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے ہاتھوں پر ظاہر فرمایا اور اسی طرح کے اور امور کہ عقلی دلائل جن کی صحت کا تقاضا کرتے ہوں۔

کبھی اس خبر کی صحت پر اس طور سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ وہ ایسے امر کی خبر ہے کہ نصِ قرآن یا سنّتِ متواترہ اس کا تقاضا کرتے ہیں یا پوری امّت اس کی تصدیق پر مجتمع ہو گئی ہے یا امّت نے اس کی تلقی بالقبول کی ہے اور اس کے موجب و حکم پر اسی خبر کی وجہ سے عمل کیا ہے۔

کفایہ کی عبارت میں اصلاحی صاحب کی ایک تلبیس اور اسکا جواب

دوسری خصوصیت کا ذکر اصلاحی صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"جن کا تقاضا نصوص قرآن یا نصوص سنت کرتے ہوں۔" (مبادی تدبّر حدیث ص۲۲)

ہم کہتے ہیں کہ اصلاحی صاحب سنّت سے مراد متواترِ عملی لیتے ہیں۔ خود لکھتے ہیں:

"سنّت کی بنیاد احادیث پر نہیں ہے جن میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، بلکہ امّت کے عملی تواتر پر ہے۔" (مبادی تدبر حدیث ص۲۸)

سُنّت کی اپنی اس تفسیر کی رُو سے اصلاحی صاحب اس دوسری خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے بھی ایک غلطی کر گئے ہیں اور وہ یہ کہ انہوں نے "نصوصِ سُنّت" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ حالانکہ نص (نصوص کا واحد)

تصریح اور عبارت کو کہتے ہیں۔ جیسے کہ نص قرآن سے مراد آیت ہوتی ہے۔ اب نص حدیث کی تو ہوتی ہے کیونکہ اس کی عبارت موجود ہوتی ہے۔ عملی تواتر کی تو کوئی عبارت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اصلاحی صاحب کی اپنی تفسیر کے مطابق تو یہ ترجمہ خود ان کی تفسیر کے خلاف ہے۔

ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ کفایہ کی عبارت میں سنّتِ متواترہ کے لیے نصوص کے الفاظ کو مضاف نہ بنایا جائے، بلکہ نصوصِ قرآن کی طرف خود سنّتِ متواترہ ہی کو فاعل سمجھا جائے۔ صاحب الکفایہ کی عبارت یوں ہے۔ بان یکون خبرا عن امر اقتضاہ نص القرآن أو السنة المتواترة ہمارے قول کے مطابق سنت متواترہ کی فاعلیت میں اس کے تمام افراد شامل ہوں گے۔ متواتر لفظی و معنوی بھی اور متواتر عملی بھی۔ اور اگر ہم سنّتِ متواترہ کی نص کا مضاف الیہ قرار دیں تو پھر متواترِ عملی شامل نہیں رہتا۔ صرف متواترِ لفظی اور متواترِ معنوی شامل رہتے ہیں۔

اس کے برعکس اصلاحی صاحب تو متواترِ لفظی و معنوی کے قائل ہی نہیں ہیں صرف متواترِ عملی کے قائل ہیں جبکہ متواتر عملی کی کوئی نص نہیں ہوتی، لہٰذا ان کی اپنی تفسیر کے مطابق ان کا کیا ہوا ترجمہ ہی غلط ہے۔

اصلاحی صاحب کی دوسری تلبیس اور اسکا جواب

اصلاحی صاحب نے پہلی خصوصیت ذکر کرتے ہوئے یہ کلمات بھی تحریر کیے ہیں "اور جن کو عقل عام (COMMON SENSE) قبول کرتی ہو"۔

الکفایہ کی عبارت اور اس کا ترجمہ ہم نے نقل کیا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس کا ترجمہ یا مفہوم یہ نکلتا ہو جو اصلاحی صاحب نے اس مذکورہ جملہ میں بیان کیا ہے۔ ہم یہ ان کی جانب سے شعوری یا غیر شعوری تلبیس سمجھتے ہیں، کیونکہ عام عقل (COMMON SENSE) تو عقل کی وہ مقدار ہوتی ہے جو ہر عاقل (یعنی غیر مجنون) بالغ شخص میں ہوتی ہے اور اس سے وہ عام فہم باتیں سمجھ سکتا ہے یعنی بدیہیات اور وہ نظریات (مالوفہ) جو قریب قریب بدیہیات کے ہوں۔ باقی رہے دیگر نظریات (غیر مالوفہ) تو ان کی معرفت و ادراک عام عقل (COMMON SENSE) کے بس کی بات نہیں ہوتی اور یہ اس کے دائرہ ادراک سے ماوراء ہوتے ہیں۔

اصلاحی صاحب کی اس تلبیس کا جو اثر ہوگا وہ یہ ہوگا کہ ہر شخص جو اپنی عام عقل اور COMMON SENSE کے خلاف جس بات کو بھی دیکھے گا اس کو رد کر دے گا اور وہ اس بارے میں کسی دوسرے کے دلائل سننے پر بھی آمادہ نہیں ہوگا، کیونکہ COMMON SENSE کے دائرہ اثر میں بدیہیات ہوتے ہیں جو محتاج دلیل نہیں ہوتے

جبکہ دلائل دیئے جاتے ہیں نظریات کے لیے۔ لہٰذا اصلاحی صاحب نے شعوری اور غیر شعوری طور پر ہر شخص کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ اپنی عقل کے مطابق احادیث کو قبول یا رد کر دے اور ظاہر ہے کہ انکارِ حدیث کے لیے اس سے بڑھ کر مؤثر ہتھیار اور کیا ہوگا۔

باقی صاحبِ کفایہ نے جو یہ کہا ان یکون مما تدل العقول علی موجبہ تو اس کی خود انہوں نے آگے تفسیر کر دی کہ مما ادلۃ العقول تقتضی صحتہ کہ دلائلِ عقلیہ جن کی صحت کا تقاضا کرتے ہوں تو صحت و عدم صحت

میں اصل دار و مدار دلائلِ عقلیہ پر ہے جو مسلمہ عند الکل ہیں محض عقلوں پر نہیں کہ جن کو دھوکہ بھی لگ سکتا ہے۔ ہماری اس بات پر بین دلیل عقلاء کا آپس میں اختلاف ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ لوگوں نے بعض صحیح احادیث کو خلافِ عقل قرار دیکر رد کیا ہے۔ مثلاً

مصطفیٰ احسنی سباعی رحمہ اللہ اپنی کتاب مترجم "اسلام میں سنّت و حدیث کا مقام" میں لکھتے ہیں:

"امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ جنّت میں ایک درخت ایسا ہے کہ اس کے سایہ میں سوار سو سال تک چلتا ہے۔ اس حدیث کو پروفیسر ابوریہ بعید از عقل قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ ضمناً اس حدیث کے جھوٹ ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ ۔ ۔ آپ پروفیسر ابوریہ سے ذرا یہ تو پوچھئے کہ جناب ذرا بتلایئے کہ یہ حدیث بعید از عقل کیوں ہے؟" ص۷۲ ج ۱

اسی سلسلہ کی ایک اور مثال لیجئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور حدیث ہے جس کی امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں اور امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم میں تخریج کی ہے، مگر پروفیسر ابوریہ اس کی صحت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ مرفوع حدیث یہ ہے:

"ایک مرتبہ جنّت اور دوزخ میں جھگڑا ہوا۔ دوزخ نے کہا میں تجھ سے برتر ہوں۔ اس لیے کہ جتنے بڑے بڑے اور مغرور و متکبر لوگ ہیں وہ خاص طور پر میرے لیے چن لیے گئے ہیں، تو جنّت اس پر کہنے لگی واقعی یہ کیا بات ہے میرے ہاں صرف دنیا کے کمزور اور گرے پڑے بے حیثیت لوگ ہی آئیں گے؟ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے جنت سے فرمایا، تُو جانتی نہیں، تو تو میری خاص رحمت کا مقام ہے۔ اپنے بندوں میں سے جن پر میں رحم کرنا چاہوں گا تیرے ہی ذریعہ ان پر رحم کروں گا (اور تیرے پاس بھیجوں گا) اور دوزخ سے فرمایا تُو تو سراپا قہر و عذاب (کا مقام) ہے۔ اپنے بندوں میں سے جن کو میں عذاب دینا چاہوں گا تیرے ہی ذریعہ عذاب دوں گا اور تیرے پاس بھیجوں گا۔ بہرحال تم میں سے ہر ایک کو بھرنا ضرور ہے، چنانچہ دوزخ کا پیٹ اس وقت تک نہیں بھرے گا جب تک

خدا اس پر اپنا پاؤں نہ رکھے گا تب وہ کہے گی بس بس تو اس وقت وہ بھر جائے گی (یعنی اللہ جلّ جلالہٗ کے قہر و غضب پر رحم وکرم غالب آجائے گا تو دوزخ کا پیٹ بھر جائے گا۔) اور اس کا ایک حصّہ دوسرے حصّہ سے مل جائے گا۔ (اور جہنمی اس کے درمیان پس جائیں گے)

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس حدیث کو بعید از عقل و قیاس سمجھنے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے ؟" ص۲۷ ج ۱

شیخ مصطفیٰ اسباعی رحمہ اللہ نے جواب میں خاصی تفصیل سے کلام کیا ہے جو چاہے ان کی کتاب کا مطالعہ کرلے ہمارے پیشِ نظر تو چونکہ اس بات کی چند مثالیں پیش کرنا تھا کہ بعض لوگوں نے صحیح احادیث کو بھی خلافِ عقل قرار دیا ہے، حالانکہ ان میں خلافِ عقل ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

اسی طرح سے معتزلہ نے بھی بہت سی احادیثِ صحیحہ کو خلافِ عقل کہا۔ ابن قتیبہ رحمہُ اللہ نے اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" میں ان کی تکذیب کی چند مثالیں بھی دی ہیں اور ان کے جوابات بھی لکھے ہیں۔

اور ہمارے اپنے اس دور میں اور ہمارے علاقوں میں بھی یہ فتنہ خاصہ نمایاں ہے کہ لوگ فقط کتبِ حدیث کے تراجم پڑھ کر یا کچھ عربی کی شدبد حاصل کر کے ان کتب کا مطالعہ کرتے ہیں اور کتنی ہی صحیح اور دلائلِ عقلیہ کے بالکل مطابق احادیث کو اپنی عقل ناقص کی وجہ سے خلافِ عقل قرار دے کر مطعون کرتے ہیں۔

اس پورے پس منظر کی روشنی میں اصلاحی صاحب کی اس اختراعی عبارت "اور جن کو عام عقل (COMM-ON SENSE) قبول کرتی ہو" کو ہم تلبیس کہتے ہیں تو ناجائز نہیں کہتے۔

یہاں مقام اور بحث کی مناسبت سے ہم چاہتے ہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب "انتباہات مفیدہ" سے چند اصولی باتیں نقل کر دیں (کہیں کہیں الفاظ میں رائج اسلوب کی خاطر تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔)

اصول نمبر ۱ : کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا دلیل اس کے باطل ہونے کی نہیں۔

شرح : باطل ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ دلیل سے اس کا نہ ہونا سمجھ میں آجائے۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں امر میں یعنی ایک یہ کہ اس کا ہونا سمجھ میں نہ آئے۔ اور ایک یہ کہ اس کا نہ ہونا معلوم ہو جائے۔ فرق عظیم ہے اوّل کا (یعنی یہ کہ اس کا ہونا سمجھ میں نہ آتے) حاصل یہ ہے کہ بوجہ عدم مشاہدہ اس چیز کے اسباب یا کیفیات کا ذہن کو احاطہ نہیں ہوا اس لیے ان اسباب یا کیفیّات کی تعین میں تحیر و تردد ہے، لیکن بجز اس کے کہ یہ کہے کہ یہ کیونکر ہو گا وہ اس پر قادر نہیں کہ اس کی نفی پر کوئی دلیل صحیح ... قائم کرسکے۔ (خواہ وہ) عقلی (ہو) یا نقلی (ہو) اور ثانی کا (یعنی یہ کہ اس کا نہ ہونا معلوم ہو جاتے) حاصل یہ ہے کہ عقل اس کی نفی پر عقلی یا نقلی صحیح دلیل قائم کرسکے۔

مثلاً کسی دیہاتی نے جس کو ریل دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا یہ سنا کہ ریل کسی جانور کے گھسیٹنے کے بغیر خود بخود چلتی ہے تو تعجّب سے کہے گا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ اس پہ قادر نہیں کہ اس کی نفی پہ دلیل قائم کر سکے، کیونکہ اس کے پاس خود اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ جانور کے گھسیٹنے کے علاوہ گاڑی کی حرکت سریعہ ممتدہ کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا۔ اس کو سمجھ میں نہ آنا کہتے ہیں اور اگر وہ محض اسی پہ نفی کا حکم کرنے لگے اور راوی کی تکذیب کرنے لگے تو عقلاً اس کو بے وقوف سمجھیں گے اور اس بے وقوف سمجھنے کی بنا صرف یہی ہو گی کہ تیری سمجھ میں نہ آنے سے نفی کیسے لازم آئی۔ یہ مثال ہے سمجھ میں نہ آنے کی۔ اور اگر کوئی شخص کلکتہ سے ریل میں سوار ہو کر دہلی اترا اور ایک شخص نے اس کے روبرو بیان کیا کہ یہ گاڑی کلکتہ سے دہلی تک آج ایک گھنٹہ میں آئی ہے تو وہ مسافر اس کی تکذیب کرے گا۔ اور اس کے پاس اس کی نفی کی دلیل موجود ہے جو اپنا مشاہدہ اور سو دو سو مشاہدہ کرنے والوں کی (جو اسی گاڑی سے اترے ہیں) شہادت ہے۔ یہ مثال ہے اس کی کہ اس کا نہ ہونا سمجھ میں آ جائے۔

اسی طرح اگر کسی نے یہ سنا کہ قیامت کے روز پلصراط پر چلنا ہو گا اور وہ بال سے باریک ہو گا، چونکہ کبھی ایسا واقعہ دیکھا نہیں اس لیے یہ تعجّب ہونا کہ کیونکر ہو گا تعجّب نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس کی نفی پر عقل کے پاس کوئی دلیل نہیں، کیونکہ سرسری نظر میں دلیل اگر ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ قدم تو اتنا چوڑا اور قدم رکھنے کی چیز اتنی کم چوڑی تو اس پہ پاؤں کا ٹکنا اور چلنا ممکن نہیں، لیکن خود اسی کا کوئی ثبوت نہیں کہ راستہ کی وسعت قدم سے زیادہ ہونا عقلاً ضروری ہے اور یہ بات ہے کہ عادت یوں ہی دیکھی گئی ہے اس کے خلاف نہ دیکھا ہو یا دیکھا ہو مگر اتنا تفاوت نہ دیکھا ہو جیسے بعض کو اسی پر چلتے دیکھا ہے، مگر اس میں کیا محال ہے کہ وہاں عادت بدل دی جائے۔ اس بنا پر اگر کوئی تکذیب کرے گا تو اس کی حالت اسی شخص کی سی ہو گی جس نے ریل کے از خود چلنے کی تکذیب کی تھی۔ البتہ اگر کسی نے یہ سنا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں فلاں بزرگ کی اولاد کو اگرچہ وہ مومن بھی نہ ہوں۔ اس بزرگ کے قرب کی وجہ سے مقرب و مقبول بنا لے گا۔ چونکہ اس کے خلاف پہ دلیل قائم ہے اور وہ دلیل وہ نصوص ہیں جن سے کافر کا نہ بخشا جانا ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی نفی کی جائے گی۔ اور اس کو باطل کہا جائے گا۔

یہ فرق ہے سمجھ میں نہ آنے اور باطل ہونے میں۔

اصول نمبر ۲ : جو امر عقلاً ممکن ہو اور دلیلِ نقلی صحیح اس کا وقوع بتلاتی ہو تو اس کے وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر دلیل نقلی (صحیح) اس کا عدم وقوع بتلائے تو عدم وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔

شرح : واقعات تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے ہونے کو عقل ضروری اور لازم بتائے۔ مثلاً ایک

آدھا ہے دو کا۔ یہ امر ایسا لازم الوقوع ہے کہ ایک اور دو کی حقیقت جاننے کے بعد عقل اس کے خلاف کو یقیناً غلط سمجھتی ہے۔ اس کو واجب کہتے ہیں۔

دوسری قسم وہ جن کے نہ ہونے کو عقل ضروری اور لازم بتائے۔ مثلاً ایک مساوی ہے دو کا۔ یہ امر ایسا لازم النفی ہے کہ عقل اس کو یقیناً غلط سمجھتی ہے۔ اس کو ممتنع اور محال کہتے ہیں۔

تیسری قسم وہ جن کے نہ وجود کو عقل لازم بتائے اور نہ نفی کو ضروری سمجھے، بلکہ دونوں شقوں کو محتمل قرار دے اور ہونے نہ ہونے کا حکم کرنے کے لیے کسی اور دلیل نقلی پر نظر کرے۔ مثلاً یہ کہنا کہ فلاں شہر کا رقبہ فلاں شہر سے زائد ہے ایسا امر ہے کہ جانچ کرنے یا جانچ والوں کی تقلید کرنے کے قبل عقل نہ اس کی صحت کو ضروری قرار دیتی ہے اور نہ اس کے بطلان کو، بلکہ اس کے نزدیک احتمال ہے کہ یہ حکم صحیح ہو یا غلط ہو۔ اس کو ممکن کہتے ہیں۔ پس ایسے امر ممکن کا ہونا اگر دلیل نقلی سے صحیح ثابت ہو تو اس کے ثبوت اور وقوع کا اعتقاد واجب ہے اور اگر اس کا نہ ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے عدم وقوع کا اعتقاد ضروری ہے۔ مثلاً مثال مذکور میں جانچ کے بعد کہیں اس کو صحیح کہا جائے گا کہیں غلط۔ اسی طرح آسمانوں کا اس طور سے ہونا جیسا جمہور اہلِ اسلام کا اعتقاد ہے۔ عقلاً ممکن ہے یعنی صرف عقل کے پاس نہ تو اسکے ہونے کی کوئی دلیل ہے اور نہ نہ ہونے کی کوئی دلیل ہے۔ عقل دونوں احتمالوں کو تجویز کرتی ہے۔ اس لیے عقل کو اس کے وقوع یا عدم وقوع کا حکم کرنے کے لیے دلیل نقلی کی طرف رجوع کرنا پڑا، چنانچہ دلیل نقلی قرآن وحدیث سے اس کے وقوع پر دلالت کرنے والی ملی اس لیے اس کے وقوع کا قائل ہونا لازم اور واجب ہے۔

اصول نمبر ۳ : محال عقلی ہونا اور چیز ہے اور مستبعد ہونا اور چیز ہے۔ محال خلافِ عقل ہوتا ہے اور مستبعد خلافِ عادت۔ عقل اور عادت کے احکام جدا جدا ہیں۔ دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ محال کبھی واقع نہیں ہو سکتا۔ مستبعد واقع ہو سکتا ہے۔ محال کو خلافِ عقل کہیں گے اور مستبعد کو غیر مدرک بالعقل۔ ان دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔

شرح : محال وہ ہے جس کے نہ ہونے کو عقل ضروری بتائے اس کو ممتنع بھی کہتے ہیں جس کا ذکر مع مثال اصول نمبر ۲ میں آچکا ہے۔ اور مستبعد وہ ہے جس کے وقوع کو عقل جائز بتائے، مگر چونکہ اس کا وقوع کبھی دیکھا نہیں، دیکھنے والوں سے بکثرت سنا نہیں اس لیے اس کے وقوع کو سن کر اول وہلے میں متحیر و متعجب ہو جائے جس کا ذکر مع مثال اصول نمبر ۱ میں کسی چیز کے سمجھ میں نہ آنے کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ ان کے احکام جدا جدا یہ ہیں کہ

محال کی تکذیب و انکار محض بنا بر محال ہونے کے واجب ہے۔ اور مستبعد کی تکذیب و انکار محض بنا بر استبعاد کے جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر استبعاد کے علاوہ دیگر دلائل تکذیب کے ہوں تو تکذیب جائز بلکہ واجب ہے۔ جیسا اُوپر مثالوں سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کہے کہ ایک مساوی ہے دو کا تو اس کی تکذیب ضروری ہے اور اگر کوئی کہے کہ ریل بدون کسی جانور کے لگائے چلتی ہے تو تکذیب جائز نہیں، باوجودیکہ ایسے شخص کے نزدیک جس نے اب تک وہی عادت دیکھی ہے کہ جانور کو گاڑی میں لگا کر چلاتے ہیں مستبعد اور عجیب ہے۔ بلکہ جتنے واقعات کو غیر عجیب سمجھا جاتا ہے وہ واقع میں سب عجیب ہیں۔ مگر بوجہ تکرار مشاہدہ و الف و عادت کے ان کے عجیب ہونے کی طرف التفات نہیں رہا، لیکن واقع میں یہ مستبعد اور غیر مستبعد اس میں مساوی ہیں۔ مثلاً ریل کا اس طرح چلنا اور نطفہ کا رحم میں جاکر زندہ انسان ہو جانا فی نفسہ ان دونوں میں کیا فرق ہے، بلکہ دوسرا امر واقع میں زیادہ عجیب ہے، مگر جس دیہاتی نے امرِ اوّل کو کبھی نہیں دیکھا ہو اور امرِ ثانی کو وہ ہوش سنبھالنے ہی کے وقت سے دیکھتا آیا ہو تو ضرور وہ امرِ اوّل کو اس وجہ سے عجیب سمجھے گا اور امرِ ثانی کو باوجودیکہ وہ امرِ اوّل سے عجیب تر ہے عجیب نہ سمجھے گا۔

اسی طرح جس شخص نے گراموفون سے ہمیشہ باتیں نکلتے دیکھا، مگر ہاتھ پاؤں کو باتیں کرتے نہیں دیکھا وہ گراموفون کے اس فعل کو عجیب نہیں سمجھتا اور عجیب سمجھے گا تو مضائقہ نہیں، لیکن یہ سخت غلطی ہے کہ عجیب کو محال سمجھے اور محال سمجھ کر نص کی تکذیب کرے، بلا ضرورت اس کی تاویلیں کرے، غرض محض استبعاد کی بنا پر اس میں احکام محال کے جاری کرنا عظیم غلطی ہے، البتہ اگر علاوہ استبعاد کے اور کوئی صحیح دلیل بھی اس کے عدم وقوع پر قائم ہو تو اس وقت اس کی نفی کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ نمبر ا میں کلکتہ سے دہلی تک ایک گھنٹہ میں ریل کے پہنچنے کی مثال ذکر کی گئی۔ اور اگر صحیح دلیل اس کے وقوع پر قائم ہو اور عدم وقوع پر اس درجہ کی دلیل نہ ہو تو اس وقت وقوع کا حکم واجب ہوگا۔ مثلاً جب تک خبر بلا تار پہنچنے کی ایجاد شائع اور مسموع نہ ہوئی تھی اس وقت اگر کوئی خبر دیتا کہ میں نے خود اس کو دیکھا ہے تو اگر اس خبر دینے والے کا پہلے سے صادق ہونا یقیناً ثابت نہ ہو تو تکذیب کی حقیقتاً تو گنجائش نہ تھی، مگر ظاہراً کچھ گنجائش ہو سکتی تھی، لیکن اگر اس کا صادق ہونا یقیناً ثابت ہوگا تو اصلاً تکذیب کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یہ ہیں وہ جدا جدا احکام محال و مستبعد کے۔

اس بنا پر پلصراط کا بکیفیت کذا یہ گزرگاہ خلائق بننا چونکہ محال نہیں صرف مستبعد ہے اور اس کے وقوع کی خبر مخبرِ صادق نے دی ہے اس لیے اس عبور کی نفی اور تکذیب کرنا سخت غلطی ہے۔ اسی طرح اس کی تاویل کرنا ایک فضول حرکت ہے۔

اصول نمبر ۴ : موجود ہونے کے لیے محسوس ومشاہدہ ہونا لازم نہیں ہے۔

شرح : واقعات پر وقوع کا حکم تین طور پر کیا جاتا ہے۔ ایک مشاہدہ جیسے ہم نے زید کو آتا ہوا دیکھا۔ دوسرے مخبرِ صادق کی خبر جیسے کسی معتبر آدمی نے خبر دی کہ زید آیا۔ اس میں یہ شرط ہوگی کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ صحیح اس کی تکذیب کرنے والی نہ ہو۔ مثلاً کسی نے یہ خبر دی کہ زید رات آیا تھا اور آتے ہی تم کو تلوار سے زخمی کیا تھا، حالانکہ مخاطب کو معلوم ہے کہ مجھ کو کسی نے زخمی نہیں کیا۔ اور نہ اب وہ زخمی ہے۔ پس یہاں مشاہدہ اس کی تکذیب کرنے والا ہے۔ اس لیے اس خبر کو غیر واقع کہیں گے۔ تیسرے استدلال عقلی جیسے دھوپ کو دیکھ کر کہ آفتاب کو نہ دیکھا ہو اور نہ کسی نے اس کے طلوع کی خبر دی (مگر چونکہ معلوم ہے کہ دھوپ کا وجود موقوف ہے طلوعِ آفتاب پر۔ اس لیے) عقل سے پہچان لیا کہ آفتاب بھی طلوع ہو گیا ہے۔

ان تینوں واقعات میں وجود کا حکم تو مشترک ہے، لیکن محسوس صرف ایک واقعہ ہے اور باقی دو غیر محسوس ہیں تو ثابت ہوا کہ یہ ضرور نہیں کہ جس امر کو واقع کہا جائے وہ محسوس بھی ہو اور جو غیر محسوس ہو اس کو غیر واقع کہا جائے۔ مثلاً نصوص نے خبر دی ہے کہ ہم سے جہت فوق میں سات اجسام عظام ہیں کہ ان کو آسمان کہتے ہیں۔ اب اگر اس نظر آنے والے نیلگوں خیمہ کے سبب وہ ہم کو نظر نہ آتے ہوں تو یہ لازم نہیں کہ صرف محسوس نہ ہونے سے ان کے وقوع کی نفی کر دی جائے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ موجود ہوں اور چونکہ مخبرِ صادق نے اس کی خبر دی ہے اس لیے اس کے وجود کا قائل ہونا ضروری ہوگا۔ جیسا اصول نمبر ۲ میں مذکور ہے۔

اصول نمبر ۵ : منقولات محضہ پر دلیلِ عقلی محض کا قائم کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے ایسی دلیل کا مطالبہ بھی جائز نہیں

شرح : نمبر ۴ میں بیان ہوا ہے کہ واقعات کی ایک قسم وہ ہے جن کا وقوع مخبرِ صادق کی خبر سے معلوم ہوتا ہے۔ منقولات محضہ سے ایسے واقعات مراد ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے واقعات پر دلیل عقلی محض سے استدلال ممکن نہیں جیسا کہ نمبر ۴ کی قسم سوم میں ممکن ہے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ سکندر اور دارا دو بادشاہ تھے اور ان میں جنگ ہوئی تھی۔ اب کوئی شخص کہنے لگے کہ اس پر کوئی دلیلِ عقلی قائم کرو، تو ظاہر ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا فلسفی ہو، لیکن بجز اس کے اور کیا دلیل قائم کر سکتا ہے کہ ایسے دو بادشاہوں کا وجود اور مقاتلہ کوئی امرِ محال تو ہے نہیں، بلکہ ممکن ہے اور اس ممکن کے وقوع کی معتبر مؤرخین نے خبر دی ہے اور جس ممکن کے وقوع کی خبر مخبرِ صادق دیتا ہے اس کے وقوع کا قائل ہونا واجب ہے۔ جیسا نمبر ۲ میں مذکور ہوا۔ اس لیے اس واقعہ کا قائل ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح قیامت کا آنا اور سب مردوں کا زندہ ہوجانا اور نئی زندگی کا دور شروع ہونا ایک واقعہ منقول محض (بالتفسیر المذکور) ہے تو اس کے دعویٰ کرنے والے سے کوئی شخص دلیل عقلی محض کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان واقعات کا محال عقلی ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں، گو سمجھ میں نہ آئے۔ پس ممکن ٹھہرا اور اس امر ممکن کے وقوع کی ایسے شخص نے خبر دی ہے جس کا صدق دلائل سے ثابت ہے۔ اس لیے حسب نمبر ۲ اس کے وقوع کا قائل ہونا واجب ہوگا۔

اصول نمبر ۶ : نظر اور دلیل جس کو آجکل ثبوت کہتے ہیں ایک نہیں اور مدعی سے دلیل کا مطالبہ جائز ہو، مگر نظر کا مطالبہ جائز نہیں۔

اصول نمبر ۷ : دلیل عقلی و نقلی میں تعارض کی چار صورتیں عقلاً محتمل ہیں۔

ایک یہ کہ دونوں قطعی ہوں۔ اس کا کہیں وجود نہیں نہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ صادقین میں تعارض محال ہے۔

دوسرے یہ کہ دونوں ظنی ہوں۔ یہاں جمع کرنے کے لیے گو ہر دو میں صرف عن الظاہر کی گنجائش ہے، مگر زبان کا اس قاعدے سے کہ اصل الفاظ میں حمل علی الظاہر ہے۔ نقلی دلیل کو ظاہر پر رکھیں گے۔ اور دلیل عقلی کی دلالت کو حجت نہ سمجھیں گے۔

تیسرے یہ کہ دلیل نقلی قطعی ہو اور دلیل عقلی ظنی ہو۔ یہاں یقیناً نقلی کو مقدم رکھیں گے۔

چوتھے یہ کہ دلیل عقلی قطعی ہو اور دلیل عقلی ظنی ہو۔ ثبوتاً یا دلالۃً۔ یہاں عقلی کو مقدم رکھیں گے، نقلی میں تاویل کریں گے۔

پس صرف یہ ایک موقع ہے درایت (دلیل عقلی) کی تقدیم کا روایت (نقلی دلیل) پر نہ یہ کہ ہر جگہ اس کا دعویٰ یا استعمال کیا جائے۔ (انتہی)

اصلاحی صاحب کی تیسری تلبیس اور اس کا جواب

اسی موقع پر آگے امین احسن اصلاحی صاحب دوسرے درجہ کی روایات کے بارے میں یوں لکھتے ہیں :

" دوسرے درجہ میں صاحب الکفایہ ان روایات کو رکھتے ہیں جو مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہوں

(۱) جن کا عقل رد کرتی ہو۔ الخ "

اس خصوصیت کو ذکر کرنے میں بھی اصلاحی صاحب نے اسی سابقہ تلبیس سے کام لیا ہے، کیونکہ صاحب الکفایہ نے اس خصوصیت کو محض اس طرح ذکر نہیں کیا، بلکہ انہوں نے کامل طور پر اس کو یوں ذکر کیا ہے۔

ان یکون مما تدفع العقول صحته بموضوعها والادلة المنصوصة فیها نحو الاخبار عن قدم الاجسام ونفی الصانع وما اشبه ذلك۔

وہ اخبار ہوں جن کو عقول ان اخبار کے موضوع اور ان اخبار کے بارے میں دلائل منصوصہ کی بنا پر رد کرتی ہوں جیسے اجسام کے قدم کی اور صانع و خالق کی نفی کی اور اس طرح کی دیگر امور کی خبریں و اخبار۔

صاحب الکفایہ کی ذکر کی ہوئی زائد قیودات کو ترک کرنے میں وہ مفاسد مضمر ہیں جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔

(بقیہ : حقیقتِ حج)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ ان کی صورت بناؤ، سیرت اختیار کرو صورت اور سیرت کی تابعداری کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارا عاشق بن جائے گا۔

اللہ کے سامنے گریہ وزاری کرو، توبہ کرو، اس سے مایوس نہ ہو، جب تک موت نظر نہ آئے توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں حتی الامکان کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا اور سنتا ہے جیسا کہ اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اسی بے باک بھی مت بنو۔ اس سے ہر وقت ڈرتے رہو۔ چلتے پھرتے کھاتے پیتے، سوتے جاگتے ہر وقت اس کا ذکر کرتے رہو۔ اگر ذکر کی عادت ڈالو گے تو سوتے وقت بھی ذکر جاری رہے گا اور مرنے کے وقت آخری سانس تک ذکر جاری رہے گا اور موت کے بعد جب اٹھو گے اور قیامت قائم ہو گی تو آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں گے۔

دُعا کرو کہ ہم سب کا خاتمہ ایمان پر ہو اور آقائے نامدار محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب ہو۔

(بقیہ : مجاہدِ عظیم)

تھی وہ اب برسرِ بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھیں اور خون شہادت کے چھینٹے حرفِ حکایات کو نقش و سواد بنا کر صفحہ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔

؎ آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

(تذکرہ مولانا آزادؒ)

مولانا نعیم الدّین صاحب ، فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ

ایک بزرگ کی نصیحت

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ (م ۵۰۵ ھ) فرماتے ہیں :

"کان لگا کر سنو ایک بزرگ کی نصیحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کو اپنی طاعت میں چھپا رکھا ہے لہٰذا کسی طاعت و عبادت کو کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو حقیر نہ سمجھو کیا خبر ہے کہ اس کی رضامندی اسی میں چھپی ہوئی ہو۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے اپنی ناراضی اور غصّہ کو معصیّت میں چھپا دیا ہے۔ پس کسی معصیّت کو کیسی ہی ذرا سی کیوں نہ ہو کبھی معمولی نہ سمجھو۔ کیا خبر ہے شاید اسی میں اس کی ناراضگی اور غصّہ چھپا ہوا ہو۔ اسی طرح اپنی ولایت اور قرب کو اپنے بندوں میں مخفی رکھا ہے، لہٰذا کسی بندہ کو کیسا ہی گنہگار کیوں نہ ہو کبھی حقیر نہ سمجھو کیا خبر ہے کہ شاید کسی عمل میں اس کی رضامندی ہو جس کا ظہور اس کے انتقال کے وقت دفعتہً ہو جائے۔"[1]

نقل بمطابق اصل

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ جب تخت نشین ہوئے اور لوگوں کو انعام تقسیم ہوا۔ ایک بہروپیہ بھی آیا۔ عالمگیرؒ نے پہچان لیا اور یہ فرمایا کہ جب دھوکہ دو گے تب انعام ملے گا۔ وہ چلا گیا۔ مختلف وقتوں میں مختلف روپ بدل کر آیا، مگر عالمگیرؒ دھوکے میں نہ آئے۔ اس کو معلوم ہوا کہ فلاں مہم پر بادشاہ جانے والے ہیں کچھ مدّت قبل سے رستہ

---

[1] تبلیغِ دین ص ۱۲۷ طبع مکتبہ مدنیہ لاہور

کی منزل پر پہنچ گیا اور درویشانہ لباس اور صورت بنا کر بیٹھ گیا۔ شہر میں شہرت ہوگئی کہ بہت بڑے درویش آئے ہوئے ہیں۔ لوگوں کا اژدہام رہتا تھا۔ عالمگیر جب اس منزل پر پہنچے حسب معمول وزیر سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی درویش یا عالم ایسے ہیں جن سے ملاقات کی جائے۔ وزیر نے عرض کیا کہ حضور ایک بہت بڑے درویش یہاں مقیم ہیں۔ فرمایا کہ ہم ضرور ان سے ملاقات کریں گے۔ یہ فرما کر اور وزیر کو ساتھ لے کر اور بغرض ہدیہ کچھ اشرفیاں لے کر وہاں پہنچے، ملاقات ہوئی بعض تصوّف کے مسائل عالمگیرؒ نے دریافت کیے جن کا جواب نہایت تسلّی بخش دیا، یہ لوگ اپنے فن کی تکمیل کے لیے سب چیزیں سیکھا کرتے تھے اس کے بعد عالمگیرؒ نے وزیر کی طرف اشارہ کیا۔ وزیر نے ہدیہ پیش کیا اس نے لینے سے انکار کیا۔ اس پر عالمگیرؒ کو زیادہ عقیدت ہوگئی اور یہ سمجھا کہ درویش کامل ہے، غرض عالمگیرؒ واپس ہوئے تو پیچھے پیچھے یہ بھی ذرا فاصلہ سے ہولیا۔ جب عالمگیرؒ دربار میں بیٹھے تو اس نے بھی پیش ہو کر جھک کر سلام کیا۔ عالمگیرؒ نے دیکھ کر غور کیا تو پہچانا اور اس کے کمالِ فن کا اقرار کیا اور انعام دیا، مگر معمولی جیسا ان لوگوں کو ملا کرتا ہے۔ اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور سلام کیا۔ پھر اس سے پوچھا کہ ہم اس وقت جو دے رہے تھے اب اتنا تھوڑا ہی دے سکتے ہیں، مگر اس وقت کیوں نہیں لیا۔ عرض کیا کہ حضور اب جو بھی عطا فرمایا ہے وہی میرے لیے سب کچھ ہے باقی اس وقت لینے سے میرے کمال میں یعنی فن نقالی میں کھنڈت پڑتی وہ نقل صحیح نہ ہوتی کیونکہ نقل صحیح وہ ہوتی ہے جو اصل کے مطابق ہو اور یہ بات درویشی کے خلاف ہے کہ وہ دنیا کو حاصل کریں اور مَیں نے ان کی صورت بنائی تھی اگر لیتا تو نقل صحیح نہ ہوتی۔ عالمگیرؒ کو اس کی اس بات کی بڑی ہی قدر ہوئی اور مکرر انعام دیا۔"[1]

اختلافُ اُمّتی رحمۃٌ

مسائل و معاملات میں اختلافِ رائے ہوجانا ایک فطری عمل ہے۔ اگر یہ اختلاف اخلاص و للّٰہیت پر مبنی ہو تو باعثِ رحمت ہوتا ہے اور اگر اس میں نفسانیت آجائے تو یہ اختلاف باعثِ رحمت ہونے کے بجائے فتنہ و فساد کا سبب بن جاتا ہے۔ ہمارے اسلاف و اکابر میں ہونے والا اختلافِ رائے

---

[1] الافاضات الیومیہ ج ۲ ص ۳۰۷

انتہائی خلوص وللّٰہیت پر مبنی ہوتا تھا اسی لیے ان کے اندر آپس میں محبّت و پیار تھا اور وہ باہم شیر و شکر ہوکر رہتے تھے۔ ذیل میں چند واقعات دَرج کیے جاتے ہیں جن سے اس حقیقت کا کھل کر اظہار ہوتا ہے۔

مولانا انظر شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"دہلی میں ایک صاحب کی اہلیہ تھیں جو بار بار اپنے میکے جاتیں۔ شوہر نے صورتِ حال سے تنگ آکر ایک دن کہا کہ اگر آئندہ تم اپنے باپ کے گھر گئیں تو تمہارے پہ طلاق۔ اتفاقاً اس عورت کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اب اگر یہ گھر جائے تو طلاق واقع ہو، نہ جائے تو یہ ایک اور مصیبت شوہر شاہ (عبدالعزیز) صاحبؒ سے مسئلہ پوچھنے کے لیے آیا۔ اس وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ بھی شاہ صاحبؒ کی خدمت میں موجود تھے۔ شاہ صاحبؒ نے مسئلہ سُن کر فرمایا اگر تمہاری اہلیہ اپنے گھر گئیں تو طلاق ضرور پڑ جائے گی۔ شوہر یہ جواب سُن کر رونے پیٹنے لگا۔ قاضی صاحبؒ نے بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ حضرت میرا تو خیال یہ ہے کہ طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ باپ کی وفات کے بعد وہ باپ کا گھر رہا ہی نہیں، بلکہ بھائیوں کا گھر ہوگیا جبکہ وقوعِ طلاق کی شرط باپ کے گھر جانا تھا۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے باوجودیکہ استاذ تھے اپنے شاگرد کے اس اختلاف و نکتہ آفرینی کو بہت سراہا اور دل سے قبول کیا۔[1]

مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؒ مرتب "کفایت المفتی" وابنِ حضرت مفتی کفایت رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اب سے تقریباً پینسٹھ برس پہلے کا واقعہ ہے حضرت مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد کفایت اللہ نوراللہ مرقدہٗ کے ایک خاص شاگرد اور خادم مولوی عبدالتواب مرحوم مدرسہ امینیہ میں بھی پڑھتے تھے اور علماء شہر میں سے مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب مؤلف تفسیر حقانی سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ قدیم زمانے میں شہر کے علماء اپنے گھروں پر شائق طلباء کو حسبۃً للہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ ڈپٹی صاحب اور مولانا عبدالحق کے درمیان معاصرانہ چشمک تھی اور اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے پر تنقید اور نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ ڈپٹی صاحب اس معاملہ میں کچھ زیادہ بے باک تھے۔ ایک روز مولوی عبدالتواب نے ڈپٹی صاحب کی مجلس میں مولانا عبدالحق کے کچھ الفاظ

---

[1] گل افشانی گفتار ص: ۶۳

نقل کیے۔ ابھی مولوی عبدالتواب کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ڈپٹی صاحب کا پارہ چڑھ گیا غصّہ کے مارے چہرہ سُرخ ہوگیا اور بڑے زور سے ڈانٹ کر کہا" تو کون ہوتا ہے۔ وہ تو میرا معاصر اور ہمسر ہے۔ مَیں اس کو کہتا ہوں وہ مجھے کہتا ہے۔ ہم دونوں کی بات میں دخل دینے کا تجھے کیا حق ہے؟ خبردار اگر آئندہ تو نے ہمارے اختلاف میں دلچسپی لی تو گلا گھونٹ دوں گا۔" مولوی عبدالتوّاب نے یہ واقعہ خود راقم الحروف کو سنایا تھا۔ کہتے تھے کہ ڈپٹی صاحب نے اتنی سختی سے جھڑکا کہ میں لرز گیا اور کان پکڑے کہ اب کبھی نہیں بولوں گا۔"[1]

قدرت کا نظام

ہمارے یہاں صلح کل ہونے کو پسند اور" جیو اور جینے دو" کے نظریہ پر عمل کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یہ چیز اسلام میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھی گئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صلح کلیت کو پسند کرنے والوں کا دُنیا میں بھی کچھ اچھا انجام نہیں ہوا۔ اکبر بادشاہ کا صلح کل ہونا اور اورنگ زیبؒ کا باطل کے لیے تیغِ بُرّاں ہونا کسی سے مخفی نہیں، لیکن کیا اکبر کو اس کی صلح کلیت نے فائدہ دیا اور اورنگ زیبؒ کو اس کے باطل شکن ہونے نے نقصان پہنچایا؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تاریخ اس کی گواہ ہے۔ تاریخ کی اس شہادت کو ملاحظہ فرمائیے:

پروفیسر محمدؐ اسلم صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اورنگ زیب کی قبر مرہٹوں کے علاقے میں بالکل محفوظ رہی اور جب اس کے جانشین شاہ عالم اوّل نے سیواجی کے پوتے ساہو کو شاہی قید خانے سے رہا کیا تو اس نے دکن جا کر پہلا کام یہ کیا کہ اورنگ زیب کے مزار پر حاضری دی۔ یہاں بتانے کی بات یہ ہے کہ اورنگ زیب کے پردادا اکبر جس کی ہندو نوازی مشہور ہے کی قبر کو جاٹوں نے اکھاڑ کر اس کی ہڈیاں جلادی تھیں اور مقبرے کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔"[2]

---

[1] قرآنی پند نامہ صفحہ ۹ [2] سفرنامۂ ہند صفحہ ۳۸